

عنبرین ابدان



کی فروانی ہو۔ بھلا اس سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہو سکتا تھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی۔ اس دنیا میں آنے کے بعد اس نے اپنی دنیا کو آشتیا آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تب اسے بالکل بھی کسی بھی بات کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس کے پاس وہ سب تھا جو ہوتا چاہیے تھا۔ وہ سب جو زندگی کو جینے کے لیے چاہیے ہوتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد تھی۔ یعنی ان کی تمام تر محبتوں کی ایک وارث۔ اس رشتے کی نفرت کو اس کے ماں باپ نے اس کے ہونے سے محسوس کیا تھا۔ آخر وہی تو تھی جس کے ہونے سے اس کی ماں ایک عورت سے اگلے درجے پہ فائز کی گئی تھی۔ مہر کے درجے پہ۔

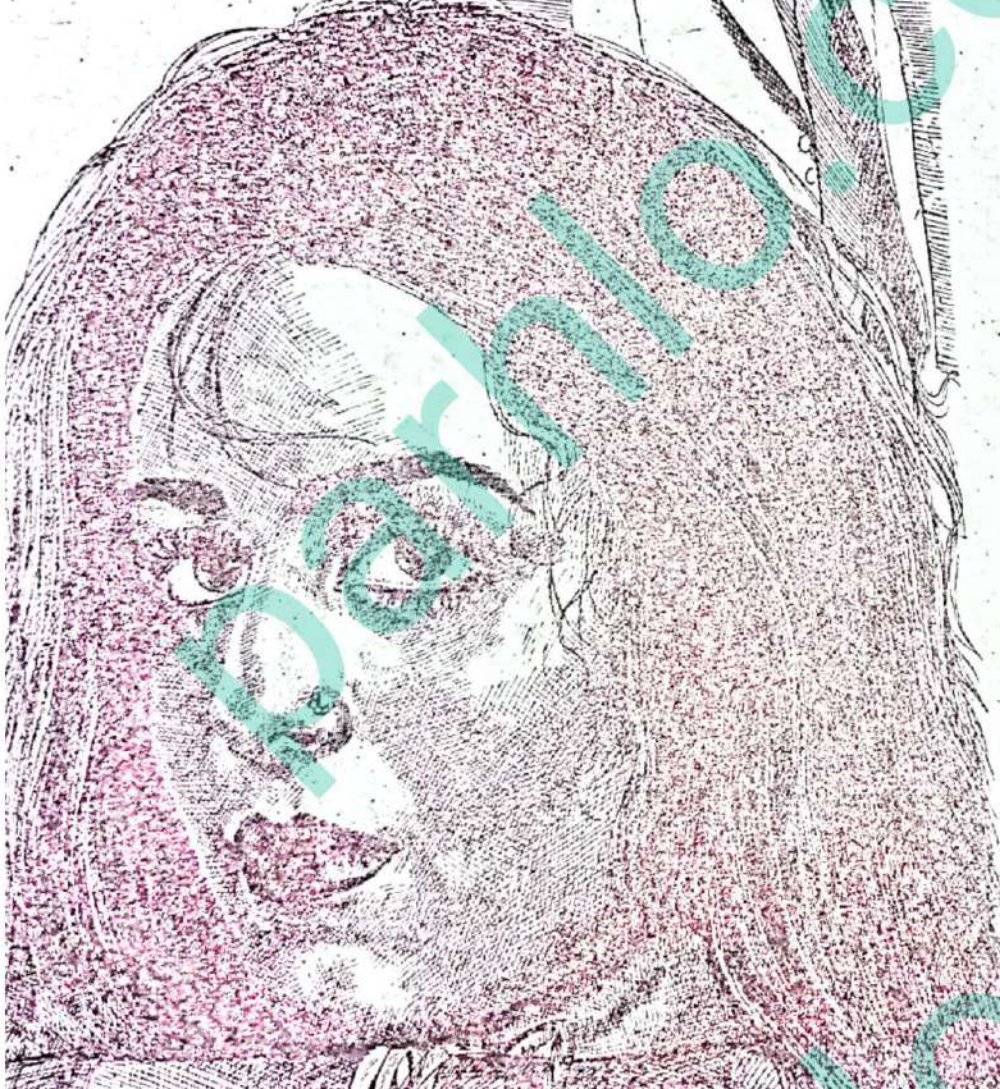
جب ہم اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں تو ہمارے ساتھ رشتوں کے حوالے بھی دے کر بھیجا جاتا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی اور پھر باقی کے تمام رشتے۔ وہ رشتے جن کا ہونا زندگی گزارنے کے لیے بہت لازم ہوتا ہے۔ یہ رشتے سانس کی مانند ضروری ہوتے ہیں۔ یہ رشتے ہمیں دنیا سے روشناس کرواتے ہیں۔ تو وہیں یہ جینے کا ڈھنگ بھی سکھاتے ہیں۔

جینا آسان نہیں ہوتا۔ ایسے میں ان رشتوں کا حوالہ بہت سی پریشانیوں اور فکروں کو دور کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اسے لگتا تھا کہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ جن کے پاس یہ مہر حوالے اور رشتوں



اور یہ معتبر ہی اس کے آنے سے اس کے باپ کے حصے میں بھی آئی تھی۔ وہ اسے باپ کے عہد سے پہ فائز کرنے کی وجہ بنی تھی۔ وہ اس کے ہونے کا حوالہ بن کر آئی تھی۔ عجب لڑی میں پروئے گئے رشتے تھے جو اپنے ہونے سے ایک دوسرے کو معجز کر رہے تھے، قابل عزت بنا رہے تھے۔ اس کا ہونا اس کے ماں باپ کو مزید قریب لے آیا تھا۔

اس نے اماں سے ہی کہتے سنا تھا۔ اولاد کا ہونا مرد اور عورت کے رشتے کو مزید مضبوط کر دیتا ہے۔ ان کے رشتے کو مزید خوب صورت بنا دیتا



ہے۔ ہاں اس نے آکر ہر رشتے کی خوب صورتی کو بڑھا دیا تھا۔ لیکن..... پھر ناچانے اس رشتے کی اس خوب صورتی کو کس کی نظر لگی تھی۔ رشتہ مضبوط ہونے کے بجائے مزید ٹھہر گیا تھا۔ مضبوط ہونے کے بجائے کمزور پڑ گیا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا تھا۔ وہ یہ سوال کئی بار دن میں خود سے کرتی۔ لیکن اسے ڈھونڈنے سے بھی اس سوال کا جواب نہ ملتا۔ یہاں تک کہ وہ سوچ سوچ کر بڑھ چلا اور تھک کر بے بسی سے اپنی ہر سوچ کو لپیٹ کر پرے رکھ دیتی۔ لیکن جیسے ہی اس کی آنکھ کھلتی۔ یہ سوال پھر یہی اس کے سامنے آ جاتا۔ اور ہمیشہ کی طرح وہ ہار جاتی تھی۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی۔ رشتوں کے حوالے کی۔ لیکن کچھ رشتے ایسے بھی بن جاتے ہیں جن کا حوالہ آپ کا سر جھکا دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جن کا ہونا آپ کو اندر تک شرمندہ کروا کے رکھ دیتا ہے۔ غلطی نہ ہونے کے باوجود آپ خود کو مجرم سمجھنے لگتے ہیں۔ گویا یہ ہوتے ہوئے آپ کے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اپنے بچاؤ کے لیے لفظ بھی نہیں۔ اپنے تحفظ کے لیے ایک فقرہ بھی نہیں۔ آپ کو کیسے یہ بات سمجھ آ سکتی ہے۔ کیوں کہ آپ اس جگہ کہاں کھڑے ہوتے ہیں، جہاں سامنے والا کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی جس کے لیے قیامت برپا ہوتی ہے، محسوس اسے ہی ہوتا ہے۔ بانی سب تو..... اس نے دل گر لگی سے سوچا اور اپنا سر نیچے پر رکھ دیا تھا۔ یعنی یہ اس بات کا اشارہ تھا۔ وہ اب حریہ کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ اور نہ ہی اس کے اندر حریہ کچھ سوچنے کی ہمت تھی۔

☆☆☆

وہ کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی۔ پانی کو جوش آنے پر اس نے جیسے ہی ہتی ڈالی تھی۔ لاؤنج سے تائی جان کی تیز آواز گونجی تھی۔ اس نے بے بسی سے اپنی آنکھوں کو زور سے بند کیا تھا۔

”کتنا کہا تھا اماں سے، کتنی نہیں اور ترے لیے

تھے۔ کہ ایسی کوئی بات منہ سے نہ نکالیں۔ لیکن اماں.....“ اس نے تاسف سے سوچتے ہوئے اپنی بند آنکھوں کو کھولا۔ اور کھولتے ہوئے چوہے پہ نظریں جمادیں۔

”یہ تو بھی نہیں ہو سکتا، کم از کم میری زندگی میں تو ممکن نہیں۔“ تائی نے ہاتھ اٹھا کر صاف لفظوں میں کہا۔ انہوں نے اپنی آواز کو جان بوجھ کر اتنا اونچا رکھا تھا۔ کہ کچن میں چائے بناتی مصفاں لے۔ اور مصفاں اچھے سے ان کی بات سن بھی لی تھی۔ اور اب چوہے میں دو دو ڈال کر ریک سے کپ اٹھا کر حلیف پر رکھ رہی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ ایسے کیسے صاف انگار ہے۔“ اماں کا جلال بھی تائی جان کے انداز دہلی بھر بھی فرق نہیں ڈال سکا تھا۔ تائی ہوئی گردن اور تچی ہوئی ہنسیوں ہنوز پہلے والی کیفیت میں برقرار تھیں۔

”اماں! آپ جو مرضی کہیں اب میں نے تو آپ کو اپنا جواب بتا دیا ہے۔“ صوفیہ بیگم نے رعیت بھرے لہجے میں تھی انداز میں کہا تھا۔

اماں نے شکوہ کتناں نظروں سے صوفیہ کے دوسرے کنارے بیٹھے بیٹے کی طرف تاسف بھری نظروں سے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ اعجاز صاحب ہاں کی شکوہ بھری نظروں کے دباؤ میں آتے۔ صوفیہ بیگم پھر سے بول اٹھی تھیں۔

”اماں جی! اس میں کوئی زور زبردستی والی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ صوفیہ بیگم کے لہجے میں ملاحت تھی۔ لیکن وہ جیسے ہی چلنے کی ٹرے اٹھائے لاؤنج میں وارد ہوئی تھی۔ ان دیکھی ماتھے کی لکیریں اب واضح نظر آنے لگی تھیں۔

اس نے بے تاثر چہرے اور انداز سے چائے کی ٹرے کو سنٹرل ٹیبل پر رکھا۔ اور پلٹ کر اماں کی طرف دیکھنے لگی۔

”اماں جی! کوئی اور کام تو نہیں ہے۔“ اس کے استفسار کرنے پر اماں نے لٹی میں سر ہلایا۔ تو وہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلانی لاؤنج کے کونے میں

پڑی میز سے اپنی کتابیں اٹھا کر مضبوط قدم اٹھاتی باہر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ ظاہراً مطمئن تھی۔ آذر کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک طوفان اٹھا تھا۔ جانے کیوں اسے تائی کے انگار سے زیادہ اس کا یوں چپ رہنا کھلا تھا۔ بیٹے ہی آنسوؤں کا ایک سیلاب اس کی آنکھوں میں در آیا تھا۔ کچن میں آکر لاؤنج کی کھلی کھڑکی کے قریب آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے بارے میں سننا چاہتی تھی۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد آذر کچھ بولے گا۔ کوئی ایک آدھ فقرہ ہی کسی مگر بولے گا ضرور.....

”اور تم کیا کہتی ہو ماریہ!“ اب اماں نے چھوٹی بیوہ سے دریافت کیا تھا۔

”میں۔“ چائے کا کپ لیتے ہوئے ماریہ بیگم کو تو باقاعدہ اچھو لگا تھا۔ بھلا انہیں کب امید تھی۔ صوفیہ بیگم سے امید ہونے کے بعد وہ ڈائریکٹ قاتر سے امید باندھ لیں گی۔ اگر انہیں ذرا بھی اندازہ ہوتا۔ تو وہ گھر سے ہی اپنے طور پر تیار ہو کر آتیں۔ لیکن پھر بھی وہ عالیہ تھیں۔ انہوں نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ صوفیہ بیگم کی طرح تھوڑی تھیں۔ جذباتی اور بے وقوف۔ لیوں نے مسکراہٹ سجائے ٹٹو سے اپنے اوپر گری چائے کے چیمٹوں کو صاف کرتے ہوئے۔ انہوں نے مسکرا کر پہلے اپنے شوہر کمال کی طرف دیکھا۔ اور پھر اماں جی کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ اماں جی، لیکن بات یہ ہے کہ.....“ وہ کھٹے بھر کے گئے زکیں۔ اور لاؤنج میں موجود تمام نفوس پر ایک نظر ڈالی۔ جو سب ہی ان کی طرف متوجہ تھے۔ قاتر نے جھجھکے سے اٹھنے کے لیے بات کی ہے۔ نہ عامیری۔ نہ جی عامر بھائی کی بیٹی، قاتر اسے پسند کرتا ہے۔ اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ذکیہ بیگم جیوات تھی وہ تو میں نے آپ کے سامنے رکھ دی۔ بانی آپ جو حکم کریں گی۔ سر آنکھوں پر۔ مصفا بھی کھڑکی لڑکی ہے۔ اور دعا بھی۔ میرے

لیے تو دونوں ہی برابر ہیں۔“

عالیہ بیگم نے اطمینان سے کہتے ہوئے ہانک تاجک رکھتے ہوئے چائے کے کپ کو لیوں سے لگاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اماں جی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جن کے چہرے پر صاف مایوسی کے بادل اٹھ رہے تھے۔ تو وہیں ہمیشہ کی طرح کمال صاحب اپنی بیگم کی فرماں برداری اور تابعداری پر ان کو قربان ہو جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ عالیہ بیگم اندر سے کتاؤری ہوئی تھیں۔ یہ تو بس وہی جاتی تھیں۔ اور پھر جب اماں جی یوں تو ان کا سینے میں انگا سانس بھال ہوا۔

”جب قاتر، دعا کو پسند کرتا ہے۔ اور تم سے بھی بات کر چکا ہے۔ پھر کیا اس کا ذکر کرنا۔ تم قاتر کی بات عامر سے کرو۔ بانی جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔“ اماں جی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور ہاتھ میں پکڑی سیخ کو سیدھا کرنے لگی تھیں۔

جہاں اعجاز صاحب، ماں سے سخت شرمندہ ہوئے تھے۔ وہیں کمال صاحب سرخرو ہونے پر گردن اکڑائے بیٹھے تھے۔ اعجاز صاحب نے شکوہ بھری نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ جو ”ادھہ“ کے انداز میں سر جھٹک کر اب چائے کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

باہر کھڑکی کے پاس کھڑی مصفا نے افسردگی سے اپنے بچتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا۔ اور دل ہی دل میں اماں سے ناراض ہوئی کھڑکی سے ہٹ کر کونے میں پڑی کر سی۔ چائے بھی گئی۔

☆☆☆

”تم مجھ سے ناراض ہو۔“ رات کے کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر وہ کچن صاف کرنے کے بعد کمرے میں آئی۔ تو اماں جی نے اس سے سوال کیا تھا۔

”میں کیوں ناراض ہوں گی۔“ وہ الٹا اماں جی سے سوال کر کے اپنی جگہ پر آکر لیٹ گئی تھی۔

”تم میری جگہ نہیں ہو۔ مصفا جانے کب اجل

کا پیغام جاری ہو جائے۔ اور میں چاہتی ہوں۔“ اس سے پہلے کہ اماں اپنی بات مکمل کرتیں۔ مصفا نے جھکے سے چادر کو کھولا اور اپنا چہرہ اماں کی طرف کیا۔

”اور آپ چاہتی ہیں مرنے سے پہلے مجھے جتنا ذلیل کروا سکیں کروادیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا۔ اماں، آؤر بھائی کچھ بھی کہیں جسکی اور قائل بات تائی کی ہوگی۔ اور تائی کیا چاہتی ہیں۔ یہ میں آپ اور آؤر بھائی اچھے طریقے سے جانتے ہیں۔ اور آؤر بھائی.....“ وہ خود کو کمزور نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ لیکن اپنی بھرائی ہوئی آواز اور آنکھوں میں آنے والی نمی کو روک نہیں سکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگتی۔ اس نے چادر اوڑھی اور کروٹ بدل گئی۔

شام سے اسے تائی کے بولنے سے کہیں زیادہ آؤر کا خاموش رہنا زیادہ برا لگ رہا تھا۔ جب بات کو پورا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ تو پھر بات کرنے اور کروانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور ایک بار پھر اسے منہ کے بل زمین پر گرا دیا تھا۔ اس نے عینے میں منہ کو چھپایا۔ اور ڈھیر سا رے درو آنسوؤں کی صورت اسے دان کرنے لگی تھی۔ اور اماں بے چاری یونکی شرمندہ ہو کر اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے سچ پڑھنے لگیں۔ ان کا دماغ اب تیزی سے کچھ اور سوچنے میں مصروف تھا۔ ایسا جواب باقی سب کے ساتھ ساتھ آؤر کو بھی چونکا دیتا۔ لاڈلے کی پوتے کے ہاں باپ کے سامنے خاموشی اماں کو بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کی شہ پہ تو اماں نے سچ بات کی تھی۔ اور پھر وہی..... اماں نے سر جھکا اور سچ کے دانوں کی سمت متوجہ ہوئی تھیں۔

☆☆☆

وہ آٹوٹیک لاک کھول کر لاؤنج میں ہر سو گہری خاموشی کا راج تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے دائیں جانب نگہ کشال میں ٹائم دیکھا چار بجنے والے تھے۔ کندھے پہ لٹکتے بیک کو اس نے صوفے پہ پھینکا

اور اپنے اور دادی کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جو بچی وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی اسے سی کی خلتی نے ساری گرمی اور جس کو باہر اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ اماں نماز پڑھنے میں مصروف تھیں۔ تو وہیں اس کی نظر صوفے پہ بیٹھے آؤر پہ پڑی جو ہمیشہ کی طرح تک سب سے تیار ٹانگ سے ٹانگ چڑھا کر بیٹھے اپنے سیل فون میں مصروف تھے۔ کھٹکی کی آواز پہ انہوں نے سر اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا۔

مصفا جو فوراً ہی وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ اپنی تمام تر تیزی کے باوجود آؤر کی نظروں میں آگئی تھی۔ آؤر نے اسے دیکھتے ہی فون کو صوفے پہ ایک جانب رکھا اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ تا چاہتے ہوئے بھی مصفا نے اپنے لبوں کو ذرا سا پھیلایا۔ اور سلام کرنے کے بعد باہر نکل گئی اور بچن میں آگئی۔ وہ جانتی تھی آؤر چاہتے ہیں بیٹائیں جائے گا۔ اس لیے بہتر تھا۔ ٹائم ضائع کرنے کے بجائے وہ خود ہی چائے بناتی اور اس کے سامنے چائے کا کپ رکھ دیتی۔ مصفا نے ابھی چوہا جلا کر ساس پین رکھا ہی تھا۔ جب اس کی عتب میں آؤر کے مخصوص کلون کی خوشبو پھیلی تھی۔

”آپ جا میں چائے لے کر آرہی ہوں۔“ اس نے لپٹے بنا کہا۔ اور ساس پین میں پانی ڈال دیا۔

”مجھے پتا ہے تم اور اماں دونوں ہی مجھ سے ناراض ہو۔“ جیسے ہی آؤر کا یہ فقرہ اس کے کانوں سے گرایا تھا۔ وہ تیزی سے چلی گئی۔

”میں کیوں آپ سے ناراض ہوں گی۔ میں نہ تو آپ سے ناراض ہوں اور نہ ہی کسی اور سے۔“

غصے کی ہلکی سی لالی اس کے چہرے پہ چھائی تھی۔ اس نے ایک ناراضی بھری نظر بچن کے دروازے میں کھڑے آؤر پہ ڈالی۔ جو دونوں بازوؤں کو اپنے چوڑے سینے پہ باندھے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اماں اندر ہیں، آپ اندر جائیں۔“ وہ بے زحمتی سے کہتی چلی گئی تھی کہ کھوں میں آؤر اس کے اور

اپنے سچ قائل کو طے کر کے اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

”میں نے صاف لفظوں میں امی اور بابا سے کہا ہے۔ مجھے تم سے شادی کرنی ہے۔ میرے اتنا کہنے کے باوجود بھی امی نے فوراً سب کے سچ انکار کیا۔ سچ تو یہ ہے میں اگر تمہارے سامنے ایک بھی لفظ امی سے کہتا یا پھر اماں کی بات پہ تائید کرتا تو امی نے زیادہ دوا دیا مچا تھا۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا میری وجہ سے میری کسی بھی بات کی وجہ سے امی تمہیں یا پھر اماں کو بچی کے سامنے کچھ بھی کہیں۔ میں ابھی بھی اپنی بات پہ قائم ہوں۔ مصفا میں نے رات بابا سے صاف لفظوں میں بات کر لی ہے۔ یا تو مجھے تم سے شادی کرنی ہے یا پھر مجھے شادی کرنی ہی نہیں۔“

نرم لہجے میں بات کرتا آؤر، مصفا کے سارے غصے کو ختم کر گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی عتب سے اماں کی آواز گونجی تھی۔ جو آؤر کو اپنے ساتھ آنے کا کہہ کر واپس پلٹ گئی تھیں۔ آؤر نے ایک نظر اپنے لب کو پلٹتی مصفا پہ ڈالی اور پھر پلٹ کر اماں کے عتب میں چل پڑا تھا۔

☆☆☆

”اماں۔“ دادی کی بات سننے کے بعد آؤر کے لبوں سے شکوہ بھرے انداز میں یہ لفظ نکلا تھا۔

”مجھے اپنے سچے یہ پورا یقین ہے، وہ اب ایسی کوئی بات نہیں کرے گا۔“ اماں نے جیسے اس کے دہائی دیتے لفظ کو سنا ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس اسے اپنی ہی سنار ہی تھیں۔ اور وہ اب مزید کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے جھکے سے اٹھا۔ اور کمرے سے باہر آگیا۔ جہاں لاؤنج میں صوفے میں دبی ہوئی مصفا سرا سمی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی نظروں کو نظر انداز کرتا سر کو جھٹکتا ہوا بیرونی سمت بڑھ گیا تھا۔

اسے حقیقت اماں کی بات پہ بے حد دکھ ہوا تھا۔ جانے کیوں اسے لگتا تھا کوئی اس کا ساتھ دے یا

نہ دے لیکن اماں اس کا ساتھ ضرور دیں گی۔ لیکن یہاں تو اماں نے پہلے مرحلے میں ہی اپنے ہاتھ جھاڑ کر اسے دکھا دیے تھے۔ اس نے ایک زوردار آواز میں بیرونی گیٹ بند کیا تھا۔ جس کی دھماکی آواز لاؤنج میں بیٹھی مصفا اور اپنے کمرے میں موجود اماں نے بھی سنی تھی۔ مصفا کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی، اور وہ دروازہ کھول کر دادی کے کمرے میں آگئی۔ سامنے ہی میز پہ پڑی چائے پینے والوں کی بجا اعتنائی بہنے کے بعد منٹری ہو چکی تھی۔

”اماں! آپ نے آؤر بھائی سے کیا کہا ہے؟“ مصفا نے چائے سے نظریں ہٹائی اور اماں کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں کہا۔ اور تم ہر بات میں دخل اندازی مت کیا کرو۔ اور یہ تم نے ابھی تک یونی فارم کیوں نہیں بدلا۔“ اماں نے اپنے غصے کا رخ اس کی سمت موڑا تو مصفا ان کے غصے سے خائف ہوتے ہوئے ذرا سا دور ہو کر بیٹھی۔

”جا کر یونی فارم بدلو، کھانا کھاؤ اور پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ان سارے کپڑوں کو تہہ لگا کر ان کی جگہ پر رکھو۔“ اماں نے صوفے پہ پڑے دھلے ہوئے کپڑوں کی ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے کروٹ لے کر لیٹ گئی تھیں۔

مصفا کی آنکھوں میں تیزی سے پانی جمع ہونے لگا تھا۔ اس نے ایک شکوہ بھری نظر دادی کی پشت پہ ڈالی اور دروازے کی سمت بڑھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتی عتب سے دادی کی آواز گونجی تھی۔

”اور ہاں آؤر سے دور رہا کرو۔ بلا وجہ اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر وہ یہاں آتا بھی ہے تو میرے پاس آتا ہے۔ ضروری نہیں ہے تم اس کے سامنے آؤ۔ اور اس سے بات کرو۔“ اماں کے لہجے میں حکم تھا۔

مصفا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور دروازہ کھول

کر باہر نکل گئی۔ جانے کیوں مصفا کے باہر جانے کے بعد وادی آنسوؤں سے روئے لگی تھیں۔

شاید مصفا کی بد قسمتی یہ یا پھر شاید اپنے لاڈلے پوتے کے اس طرح دل توڑنے سے۔ لیکن جو بھی تھا۔ وہ اپنے فیصلے پر قائم رہتا چاہتی تھیں۔ آذر کی محبت اور خلوص ایک طرف لیکن صوفیہ کی بے اعتنائی اور جھنجھلاہٹ وہ سب یہ بھاری تھی۔ وہ نہیں چاہتی اب تک کی زندگی کی طرح مصفا کو اپنے آنے والی زندگی بھی حقیقت سمجھتے کہ گزرا رہی پڑے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی مصفا پوری محبت اور چاہت کے ساتھ بیاہی جائے۔ آذر کی چاہت کافی نہیں تھی۔ صوفیہ کا وہ سب کہہ دینے کے لیے کافی تھا۔ اور اماں، مصفا کی زندگی کو ایک امید کے آسرے پہ نہیں چلا سکتی تھیں۔ اور آج انہوں نے پوری سوچ بچار کے بعد امید کے اس سرے کو خود توڑ ڈالا تھا۔ وہ اپنے اس فیصلے پر دہی تو تھیں۔ لیکن مطمئن بھی بہت تھیں۔ انہوں نے ایک غنائیت بھری سانس لی۔ اور اٹھ کر خود ہی دھلے ہوئے کپڑوں کو تہ لگنے لگی تھیں۔

”پتا نہیں مصفا نے کھانا کھایا ہے یا نہیں؟“ اس سوچ نے انہیں بے چین تو کیا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح مصفا کے پیچھے نہیں تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ انہیں موسم دیکھ کر مصفا ان سے آذر کے بارے میں کوئی بھی بات کرے۔ اسی لیے سر جھٹک کر وہ اپنے سابق کام میں مصروف رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ جب سے اماں کے گھر سے آیا تھا۔ یونہی اوندھے منہ اپنے بیڑے پر اٹھا تھا۔ شوق اسے دو تین بار بلانے بھی آتی تھی۔ مگر وہ نظر انداز کیے یوں لیتا رہا تھا۔ جیسے اسے کچھ سناٹی نہیں دیا۔ اور اسے کچھ سناٹی بھی کہاں دے رہا تھا۔ اس کے کانوں میں تو بار بار اماں کے لفظ گونج رہے تھے۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ مصفا کو بھول جائے۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ مصفا کو پسند کرتا تھا یا پھر اس سے محبت۔ وہ تو بس یہ

جانتا تھا کہ شریک سفر کے طور پر اس نے ہمیشہ مصفا کو اپنے ساتھ دیکھا تھا۔ اماں کو بھی بھلا کب اعتراض تھا۔ اعتراض تھا تو..... وہ سوچتے سوچتے ہوئے رکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید آگے سوچتا۔ صوفیہ بیگم کرے میں وارد ہوئی تھیں۔

”آذر! میری جان، اماں کے لال۔ کیا ہوا ہے۔ کیوں ایسے اوندھے منہ پڑے ہو۔“ بیڈ پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے صوفیہ نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فکر مندی سے استفسار کیا تھا۔ وہ الگ بات تھی ان کی فکر مندی اسے مزید تاؤ دلا سکتی تھی۔ وہ جھپٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔

”آپ جائیں یہاں ہے۔“ بیٹا لحاظ کیے اس نے اماں کو اپنے کمرے سے جانے کا کہا تھا۔ ”آذر۔“ صوفیہ کو بیٹے کی بدتمیزی پر ششدری رہ گئی تھیں۔

وہ ایسا کب تھا۔ وہ تو نرم گھٹا اور نرم لہجے میں بات کرنے والا آذر تھا۔ یہ اس کی نرم طبیعت کا ہی اثر تھا، جو وہ خاندان بھر میں مشہور تھا۔ بیک جزیشن میں کسی کو کوئی مثال دینی ہوتی تو آذر کی دی جاتی۔ بڑھا کھٹا، اچھی چاب پہ قاتر آذر ہر ایک کی آنکھ کا تارا تھا۔ اماں یونہی تو نہیں مصفا کے لیے اس پر نڈا تھیں۔

”آذر! تم دن بدن حد سے زیادہ چڑچڑے

ہوتے جا رہے ہو۔“ صوفیہ نے جیسے شکوہ کیا تھا۔ آذر نے کچھ دیر صوفیہ کو دیکھا اور پھر سر جھٹک کر قالین پر بے نقش و نگار کود کھینے لگا۔

”آذر۔“ صوفیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا، جسے اس نے فوراً ہی جھٹک دیا تھا۔

”کیا کی ہے مصفا میں۔ بڑی لکھی ہے خوب صورت ہے۔ اور سب سے بڑھ کر مجھے پسند ہے۔ تو پھر آپ کیوں؟“ اس سے پہلے آذر اپنی بات مکمل کرتا، صوفیہ بیگم اس کی بات کاٹ چکی تھیں۔

”اس لڑکی کی میرے سامنے بات بھی مت

کرنا آذر۔ میں اسے کبھی تمہاری بیوی بنا کر اس گھر میں نہیں لے آؤں گی۔ اس کی ذات کا جو حوالہ اس کے ساتھ جڑا ہے۔ مجھے وہ لمحے بھر کے لیے بھی برداشت نہیں ہے۔ صاف بات ہے مجھے نہ اپنی نسل خراب کرنی ہے، اور نہ ہی تمہاری زندگی کو برباد کرنا ہے۔“ انہوں نے لہجے میں چٹان سی سختی سموتے ہوئے کہا تھا۔

”اس کی ذات کا اس حوالے سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اس کی ذات کا آپ ڈھول پیٹ رہی ہیں۔ اس نے کبھی انہیں نہیں دیکھا۔ اور جہاں تک بات مصفا کے اس گھر میں نہ آنے کی تو ٹھیک ہے میں اسے اس گھر میں نہیں رکھوں گا۔ میں اسے.....“ ابھی آذر کی بات مکمل بھی نہیں ہو پائی تھی کہ صوفیہ بیگم نے تو ایسا داؤ دا لیا کہ اپنے کمرے سے شوق خرا، بھی کمرے سے نکل کر آذر کے کمرے میں گئے تھے۔

”کبھی تم ہی نا میں آپ سے، نا مگن ہے وہ نا مگن۔ ارے میرے اٹکوتے بیٹے کو مجھ سے اس حد تک بدگمان کر دیا ہے۔ کہ وہ الگ رہنے کی باتیں کرنے لگا ہے۔“ صوفیہ بیگم نے تو دہائیوں کے ساتھ ساتھ اب تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔

”پلیز۔“ آذر نے اکتائے ہوئے لہجے میں اماں کی طرف دیکھا۔ باپ اور بہنوں کے سامنے جانے اسے کیوں شرمندگی ہوئی تھی۔ میں نے ایک بات کی ہے اور آپ.....“ اس نے اپنے گھٹے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے نا سلف بھری نظروں سے اماں کو دیکھتے ہوئے کہا، اور پھر کمرے سے ہی نہیں بلکہ گھر سے بھی نکل آیا تھا۔

☆☆☆

یونہی بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے گئی گھٹنے ہو گئے تھے۔ تھک کر اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی اور ڈرائیونگ سیٹ کی بیک پر سر رکھ کر آنکھوں کو بند کر لیا تھا۔

”ٹھیک کبھی ہیں اماں آپ، رشتے سکون اور

خوشی کے لیے جوڑے جاتے ہیں۔ یہاں ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ مصفا سے شادی کا مطلب ساری زندگی ماں اور بیوی کے بیچ سینڈوچ بنے رہنے کے مترادف ہوگا۔ امی اسے بھی قبول نہیں کریں گی۔“ آذر نے افسردگی سے سوچا۔ اور اپنے باپیں ہاتھ سے دونوں اطراف سے چپٹی کو پکڑ لیا۔ سردرد سے اس کا سر جھٹنے والا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا، شام کب سے ڈھل چکی تھی۔ ہر سوائے میرا پھیلا ہوا تھا۔ بالکل دیا اندھیرا جیسا وہ اس وقت اپنے اندر اترتا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے فون کی روشنی مکمل طور پر قحطی سے روشن ہو رہی تھی۔

وہ جانتا تھا گھر سے فون ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کتنا بھی اپنے گھر والوں سے ناراض کیوں نہ ہو جائے اسے لوٹ کر گھر ہی جانا تھا۔ لیکن گھر جانے سے پہلے اسے اپنی پسند سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ اور وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے خود کو اسی بات کے لیے راضی کر رہا تھا۔ مگر دل تھا کہ مصفا کے نام پر آکر شور ڈالے لنگا۔

”کاش مصفا! تم ان کی بیٹی نہ ہوتیں۔“ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے سینکڑوں بار اسی جملے کی تکرار کر رہا تھا۔ لیکن اس کے کہنے سے کیا ہونے والا تھا۔ حقیقت چاہنے سے تھوڑی بدل جاتی ہے۔ حقیقت تو بس حقیقت ہی ہوتی ہے۔ خوش نما ہو یا پھر بدرنگ، خوب صورت ہو یا پھر بد صورت۔ قابل قبول ہو یا پھر ناقابل قبول۔ حقیقت کو ان سب باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ تو بس ہوتی ہے اور ہمیشہ رہتی ہے۔ اسی طرح جس طرح مصفا کی حقیقت تھی۔ اس کی ذات سے نہیں بلکہ ذات سے منسوب حوالے سے جڑی تھی۔ مگر کوئی بھی اتنے سالوں کے گزرنے کے بعد نہ تو اس حقیقت کو بھول پایا تھا اور نہ بھولنا چاہتا تھا۔

”ایم سو ری مصفا.....“ آذر کے لیوں سے یہ فقرہ نکلا تھا۔ اور آنکھوں کی زمین پہ ٹپی سی ابھری تھی۔

”میں اتنا طاقتور نہیں ہوں کہ اپنے گھروالوں کے سامنے اس سے زیادہ کھڑا رہ سکوں، میں ان سے بھی محبت کرتا ہوں۔“ آنکھوں میں نمی بڑھتی جا رہی تھی۔ ”میں نہیں پرورینک نہیں کر پاؤں گا۔ میری ماں نہیں سمجھی بھی وہ مرتبہ اور مقام نہیں دے پائے گی۔ جس کی تم حق دار ہو۔ میری کنیت بھی نہیں سکون سے رہنے نہیں دیں گی۔ اور میں میں اتنے لوگوں کے طعنوں سے نہیں بچا نہیں سکتا۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں۔ تم اچھی زندگی جو۔ اتنی اچھی زندگی جس کی تم حق دار ہو اور میں بہت چاہنے کے بعد بھی نہیں یہ حق نہیں دلا سکوں گا۔

آنسو آنکھوں کے کنارے سے پھسلنے لگے تھے۔ آذر نے گہری سانس لی۔ سامنے پڑے نشو کے ڈبے سے نشو نکال کر اپنے چہرے پہ پھیلے آنسوؤں کو صاف کیا۔ اور پھر گاڑی کا رخ گھر کی جانب موڑ دیا تھا۔ ساری رات بھی باہر گزاردیتا جانا تو گھر ہی تھا۔ جس وقت وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ بہت حد تک خود کو نابل کر چکا تھا۔

اسے دیکھتے ہی اعجاز صاحب اور صوفیہ بیگم فخر مندی سے اس کی جانب بڑھے تھے۔ تو وہیں دونوں بیٹھیں بھی اس کے قریب آکر رک گئی تھیں۔ ”کہاں تھے تم جانتے ہو ہم کتنا پریشان ہو رہے تھے، طرح طرح کے دوسوے دلی نہیں گھر کر رہے تھے۔“ صوفیہ نے بے قراری سے اس سے پوچھا۔

”اب گھر آ گیا ہوں اور بس اب میں سونا چاہتا ہوں۔“ وہ کہہ کر ان کے سامنے سے ہٹا اور اپنے کمرے میں آکر تنکے میں منہ چھپا کر لیٹ گیا تھا۔

☆☆☆

تجربہ کار آخر تھا۔ اور تجربہ کار اداس شامیں مصفا کو جانے کیوں اداس کرتی گزر رہی تھیں۔ موسم ابھی مکمل طور پر بدلا نہیں تھا۔ دن میں سورج اپنی کرنوں کو پھیلائے گرمی کی شدت کو برقرار رکھتے ہوئے تھا۔ تو شامیں جس زدہ سی ہو رہی تھیں۔ عجیب موسم

تھا۔ اور آج کل مصفا کو موسم پھر زیادہ ہی عجیب لگ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آذر کا نہ آتا۔ کتنے دن ہو گئے تھے۔ آذر اماں سے بھی ملنے نہیں آیا تھا۔ ورنہ کچھ بھی ہو جاتا ہر روز وہ اماں کی خیریت پوچھنے اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، کا پتا کرنے ضرور آتا تھا۔ اور اگر کسی لیٹ ہو جاتا تو فون کرنا بھی نہیں بھولتا تھا۔ اور آج کل تو وہ جیسے سب کچھ بھلائے جانے کہاں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ برآمدے کے پلر سے ٹیک لگائے مصفا بے خیالی میں پلر سے لٹپٹی عیش وصال کی نیلی کے پتوں کو توڑے جا رہی تھی۔ اور آذر کو یاد کرتی جا رہی تھی کہ دفعتاً دروازے پہ ہونے والی تیز بیل نے اسے خیالوں کی دنیا سے باہر نکال کر حقیقت کی دنیا میں لا پچھا تھا۔

”سب سے بیل ہو رہی ہے اور تم یہاں کانٹوں کو بند کیے بیٹھی ہو؟“ وہ اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی جب اماں کی بارشانی گہری آواز اس کے کانوں سے ٹکرانی تھی۔ جو خشکی نظروں سے اس کے کھوئے ہوئے انداز کو دیکھ رہی تھیں۔

”بس اماں! ابھی کھول دیتی ہوں۔“ وہ اماں کی نظروں سے خائف ہوتی بھاگتی ہوئی گیٹ سے متصل چھوٹے گیٹ کو کھول چکی تھی۔ کوئی بیٹھ نہیں تھا۔ وہ حریف چند کینڈے میں گیٹ نہ کھولتی تو آنے والا شاید بیل کے بجائے دروازے کو ہی توڑ دیتا۔ چونکہ اس نے دروازہ کھولا۔ صوفیہ بیگم، اعجاز صاحب اور دونوں بیٹیوں کے ہمراہ بیٹھے مسکراتے گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ آج شاید ان کا موڈ اچھا تھا۔ جو مصفا کی بچت ہوئی تھی۔ ورنہ اس گستاخی کی سزا وہ مصفا کو دو دو چار باتیں سننا کر لیتیں۔

مصفا نے جلدی سے گلے میں پڑے دوپٹے کو کھول کر سر پہ اوڑھا اور تابی کو سلام کرنے کے بعد نش اور حرا کی طرف پلٹ گئی۔ اماں سے ملنے کے بعد وہ سب ہی افراد لاؤنچ میں موجود صوفیوں پہ بیٹھ چکے تھے۔

مصفا اماں کے اشارہ کرنے پہ ان کے لیے کولڈ ڈرنک لینے کے لیے کچن میں آچکی تھی۔ بیٹے مسکراتے چہرے اور ساتھ میں مشائی کا ڈبا، مصفا کا دل عجیب انداز میں دھڑکا تھا۔ تو وہیں کھلتی گندی رنگت میں سرخی کی آمیزش کھلی تھی۔ لیوں پر مکان آن ٹھہری تھی۔ تو وہیں آنکھیں ستارہ سی ہو کر چمکنے لگی تھیں۔ اس نے جلدی سے کولڈ ڈرنک کو گلاسوں میں ڈالا اور رے اٹھائے لاؤنچ میں آگئی۔ جہاں صوفیہ بیگم خوش گوازا انداز میں اماں سے ان کی خیریت پوچھ رہی تھیں۔

”ارے اماں! سب سے پہلے تو آپ منہ بیٹھا کریں۔“ صوفیہ بیگم نے بیٹے ہوئے کہا۔ اور نشو کو اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ میں تھا ملا گلاس نیلی پر رکھ کر مشائی کا ڈبا کھولنے لگی تھی۔ مصفا بھی اماں کے صوفیہ کی ہتھی۔ آکر ٹیک لگی تھی۔

”دوس بات کی مشائی ہے۔“ اماں نے گلاب جامن کا ٹکڑا توڑتے ہوئے استغفار کیا۔ نشو نے مشائی کا ڈبا مصفا کی سمت بڑھایا تھا۔ اس نے داوی کے توڑے ہوئے ٹکڑے کو اٹھالیا۔

”بتائیں اماں کو۔“ صوفیہ بیگم نے اعجاز صاحب کو شہد کا دیا تو خاموش بیٹھے اعجاز احمد نے کھنکھرتے ہوئے آذر کا رشتہ طے ہو جانے کی نوید سنائی۔ ”فرا صوفیہ کی بھانجی۔ اماں، ابھی صوفیہ نے آدھے منہ سے بات کیا نکالی صوفیہ نے تو جھٹ سے ہان کر دی۔ حالانکہ صوفیہ نے بہت کہا تھا۔ ارے ایسے کسے اماں بڑی ہیں۔ وہی باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں گی تو صوفیہ نے ہنس کر کہہ دیا۔ رشتہ تو طے سمجھیں۔ آذر جیسے سچے اور بڑھے لکھے لڑکے کے رشتے کو کسوچنے کی نہیں ہان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صوفیہ کہہ رہی تھی اماں سے کہتا میں بس دو، تین ماہ میں ہی پاکستان آ رہی ہوں۔ آپ بس میرے گھر آذر کی بارات ہی لے آئیے گا۔“ اعجاز احمد نے ہنس کر اماں کو بتایا۔

جہاں کھلے گندی رنگ میں ہلدی کھلی

تھی۔ وہیں لمبے بھر کے لیے اماں کا چہرہ بھی تاریک ہوا تھا۔ ان کی کتنی خواہش تھی مصفا کا رشتہ آذر سے ہو لیکن مصفا کی قسمت..... انہوں نے دل ہی دل میں سوچا اور بڑے بیٹے کی سمت متوجہ ہو گئی تھیں۔ مصفا وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ یہ دیکھے جناح کی تیز نگاہیں دور تک اس کا پتھا کر گئی ہوئی آئی تھیں۔ اس کے چہرے پہ طرہ یہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ تو اگلے ہی لمحے اس نے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو اپنے لیوں سے لگا لیا تھا۔

”اوہ! ہم اپنے اکلوتے بھائی کے لیے اسے پسند کرتے۔ تم نے سوچ بھی کیسے لیا تھا مصفا احمد۔“ حرا نے اپنے لیوں کو بیٹی کی مانند کھیلا۔ اور ماں کی سمت متوجہ ہو گئی۔ جو اماں سے آذر کی شادی کی تیاریاں ابھی سے شروع کرنے کا کہہ رہی تھیں۔

کچھ لمحے لگے تھے۔ اسے خود کو سنبھالنے میں۔ حلق میں اگلے ٹیکین پانی کے گولے کو اس نے حلق سے نیچے اتارا اور پھر گھر آئے مہمانوں کی خاطر مدارت کے لیے کچن میں چلی آئی تھی۔ اور پھر آذر سے اس کا کون سا ایسا زوردار عشق تھا جس کا تماشا سرے عام لگایا جاتا۔ بس یونہی آتے جاتے اس کی خیریت پوچھ لیتا۔ پڑھائی کے بارے میں دریافت کرتا۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں کا سوال کرتا اور پھر آخر میں دھیرے سے مسکرا دیتا۔ پسند کی بات بھی آذر نے سب سے پہلے داوی سے کہی تھی۔ وہ اس کے لیے کھانا لینے کے لیے کچن میں گئی تھی۔ جب واپس آئی تو کمرے سے آئی آواز پہ اس کے قدم خود بخود دروازے کے باہر رک گئے تھے۔ آذر بھائی اس کا نام لے رہے تھے۔

”اماں! میرا دل کرتا ہے۔ میں، آپ اور مصفا ہمیشہ ایسے ہی رہیں۔ کیا ایسا ہو نہیں سکتا؟“ آذر نے اماں سے کہا۔ تو اماں دھیرے سے ہنس بڑی تھیں۔ ”لو بھلا ایسے کسے ہو سکتا ہے۔ لڑکیوں کو کون اپنے گھروں میں بٹھا کر رکھتا ہے۔ میرا تو خیال ہے مصفا کے گرجویشن کرتے ہی اچھا سا رشتہ ڈھونڈ

کراے اپنی زندگی میں ہی اپنے گھر کا کردوں۔ اس کا فرض اچھے سے ادا کروں۔ تو سکون سے مر سکوں گی۔“ جانے کیوں اماں کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے۔

”میں آپ کے دشمن اور اچھا سا رشتہ ڈھونڈنے کی ضرورت کیا ہے۔ جب اچھا سا لڑکا آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔“ آڈر نے اپنی مسکراہٹ کو لیوں کے کناروں پہ چھانے کی کوشش کی۔ اماں کو چہرے لگے، اس کی بات کی تہہ میں پہنچنے کے لیے۔

”تم سچ کہہ رہے ہو۔“ اماں کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”بالکل سچ کہہ رہا ہوں اماں۔ مصفا مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔“

آڈر کے لہجے میں اتنی سچائی تھی کہ اندر بیٹھی اماں اور باہر دروازے میں کھڑی مصفا دونوں ہی خوشی سے جانے کون سے جہانوں کی سیر کو چلی گئی تھیں۔ آڈر اماں کا لاڈلا پوتا اور مصفا اماں کی لاڈلی پوتی اس سے اچھا اور بہتر نہ سمجھتی تھیں۔

لیکن یہ تینوں کا خیال تھا۔ باقی سب بھی ان کے ہم خیال ہوتے یہ ضروری تو نہیں تھا۔ اماں کو لگا تھا۔ بیٹے کی خوشی کے سامنے صوفی خود ہی مان جائیں گی۔ لیکن وہ غلط ثابت ہوئی تھیں۔ اور ہمیشہ کی طرح صوفیہ عیسائی بازی بھی اپنے نام کر چکی تھی۔ اور وہ اس بار بھی کچھ نہیں کر پائی تھیں۔

☆☆☆

”جب امی، اماں کو آڈر بھائی کے رشتے کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ تم نے مصفا کی شکل دیکھی تھی۔ اوماں کا ڈار! اس کی شکل دیکھنے والی تھی۔ یوں جیسے ابھی رو پڑے کی۔“

حرا نے کہنے کے بعد ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اور اس کے اس قہقہے میں خفق کے ساتھ خود صوفیہ عیسائی کا قہقہہ بھی شامل تھا۔ باہر سے آتے آڈر کا ہاتھ ہینڈل پہ یونہی دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ اس کی

نظروں کے سامنے مصفا کا معصوم چہرہ گھوم گیا تھا۔ وہ حرا کی بات نہ بھی سنتا تب بھی جانتا تھا۔ یہ بات سننے کے بعد مصفا اور اماں کو کس قدر دکھ اور تکلیف ہوئی ہوگی۔

”تکلیف اس تکلیف سے بہت کم ہے۔“ مصفا۔ جو تمہیں یہاں آنے کے بعد اسی طرح کی طعنے باتیں اور مسخرانہ نظروں سے ملتی۔ میں نے بہت کوشش کی ہے۔ تمہیں ایسی تکلیفوں سے دور رکھ سکوں۔ یقین کرو اس کوشش میں سب سے زیادہ تکلیف میرے دل کو اور مجھے ہوئی ہے۔“ آڈر دکھ سے سوچتا چلا گیا تھا۔ اور پھر لاؤنج میں داخل ہونے کے بجائے وہ پلٹا۔ اور صحن میں موجود میز میاں چڑھتا ہوا چھت پہ آ گیا تھا اور وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ دور کالی چادر اوڑھے وہ آسمان کی نہ نظر آنے والی دستوں میں جانے کیا تلاشنے لگا تھا۔

”مجھے معاف کرو مصفا۔ میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا گزرے ہوئے وقت میں بھی اتنی طاقت ہوتی ہے۔ کہ حال کی خوشیوں کو نگل سکتا ہے۔ اور ماضی بھی وہ جس سے ہمارا براہ راست کوئی تعلق بھی نہ ہو۔ جس کے رونما ہونے میں ہمارا کوئی ہاتھ بھی نہ ہو۔ پھر بھی ہمارے ہاتھ اس ماضی کے دارغ سے دارغ دار ہو جاتے ہیں۔ مجھے پتا ہے تم بہت اچھی ہو۔ بہت معصوم ہو۔ اور دیکھو مجھے سب پتا ہونے کے باوجود بھی پتا ہے کہ تمہیں اپنی ماں بہنوں کی باتوں سے بچا نہیں سکتا۔ بہت کمزور ہوں رشتوں کے معاملوں میں بہت محبت کرتا ہوں تم سے بھی۔“

وہ اب اپنا سر گھٹنوں کے گرد باندھے بازوؤں پر رکھ چکا تھا۔ جب اس کے فون کی بپ بجی تھی۔ وہ یونہی سر ہموڑے بیٹھا رہا تھا۔ کہ فون چپ ہونے کے بعد پھر سے بول اٹھا تھا۔ اس بار آڈر نے اپنی شرٹ کی اوپری جیب سے فون کو نکالا، جہاں اماں کا ٹیک بنگلہ رہا تھا۔ اس نے فوراً کال پک کی اور فون

کان سے لگا لیا تھا۔

”میں جانتی ہوں میرا بیٹا بے قصور ہے۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں اس کا یوں اس رشتے سے پیچھے ہٹ جانا صرف اور صرف مصفا کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا مصفا کو اس کے ہوتے ہوئے کوئی تکلیف ہو۔“

اماں کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ آڈر ایک دم بکھر گیا تھا۔

”اماں! مجھے آپ نے کیوں پیدا نہیں کیا۔ کاش میری ماں صوفیہ احمد نہیں آپ ہوتیں۔“ اس کے لہجے میں حسرتوں کا ایک چھان تھا۔ اماں اس کی بات پہ دھڑکے سے ہنس پڑی تھیں۔

”پاشا! ماں ہے تیری۔ تم آئے کیوں نہیں اماں کی باتیں آتی۔“ اماں نے شکوہ کیا۔

”کیسے آتا۔ حوصلہ نہیں ہو رہا اماں، مصفا کا سامنا کرنے کا۔ آپ یہ بات سمجھ سکتی ہیں لیکن مصفا۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

”تم فکر نہیں کرو ایک دم سے اسے پتا چلا تو ناراض ہے۔ لیکن میں اسے سمجھا دوں گی۔ پتا ہے نا میرے سمجھانے سے وہ سمجھ جائے گی۔ تم فکر نہیں کرو۔ اور اس بھی مت ہو۔ سچی بھی ہم نہیں بس وقت بے وقافتی کرتا ہے۔ سمجھ جائے گی۔“ اماں نے اسے تسلی دی۔ تو آڈر کو لگا جیسے اس کے جلتے بدن پہ کسی نے ٹھنڈے پانی کی پھوار ڈال دی ہو۔

حریہ چند باتیں کرنے کے بعد اماں نے اسے گھر آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ اور پھر حریہ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد آڈر میز میاں اتر آیا تھا۔ لاؤنج میں ان تینوں خواتین کے ساتھ اب اعجاز احمد کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ اور وہ چاروں پورے جوش و خروش کے ساتھ آڈر کی شادی کی تیاریوں کی پلاننگ کر رہے تھے۔

”آڈر بھائی! آئیں نہ۔ آپ بھی ہمارے ساتھ بیٹھیں۔“ حرا نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے آڈر کا بازو تھام کر محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”میں تم کا ہوا ہوں۔ اس وقت آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ ہمیشہ کی طرح وہ بہت چاہنے کے باوجود بھی حرا سے ناراض نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے گال کو ہولے سے چھپتا کر وہ اپنے کمرے کی سمت بڑھ چکا تھا۔ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے آڈر نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ جس سے اس نے حرا کا کال چھپایا تھا۔ وہ اس سے ناراض تھا۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اپنی ناراضی کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔

”جانے میں کیوں ہوں ایسا؟ مجھے غصہ کرنا کیوں نہیں آتا۔ ناراض ہونا بھی نہیں آتا۔ جبکہ میرے اپنے ان کاموں میں اچھے خاصے خود غفل ہیں۔“ آڈر نے لیوں پہ استہزاء سے مسکراہٹ ابھری۔ اور پھر وہ اپنے سر کو جھٹکنا ہوا فرش ہونے کے لیے ہاتھ روم کی سمت بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

اسے آئے ہوئے کتنی دیر ہو گئی تھی اور مصفا ایک بار اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ آڈر نے شکوہ بھری نظر اماں سے ڈالی تھی۔

”آپ تو کہہ رہی تھیں۔ آپ اسے سمجھا دیں گی۔“ چائے کا خالی کپ واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے آڈر نے اماں سے کہا تھا۔

”ہاں سمجھا دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی۔“ اماں کے طمانیت بھرے انداز میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ جب کہ آڈر کا اطمینان بھرا انداز اب بے چینی میں ڈھل چکا تھا۔

”اماں پلیز! مصفا کو ایک بار بلا دیں۔ میں اس سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ میں اس سے سچ میں بہت شرمندہ ہوں۔“ آڈر کے لہجے میں کتنی عیاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ اماں کچھ کہیں۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور آڈر کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

”اگر آپ واقعی میں شرمندہ ہیں۔ تو پلیز اماں سے کہہ دیں۔ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔ انفلکٹ مجھے کبھی بھی شادی نہیں کرنی۔ مجھے مزید ہر ایک کے

سائے ذلیل مت کروائیں۔“ کہتے ہوئے مصفا کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

آؤرنے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔
”مصفا زیادہ زبان چلانے کی کوشش مت کیا کرو۔ چلو جاؤ یہاں سے۔“ اماں نے اسے منتر سے ہٹانا چاہا تھا۔

”نہیں جاؤں گی۔ تب تک تو بالکل بھی نہیں جاؤں گی جب تک آپ مجھ سے وعدہ نہیں کریں گی۔“ وہ شیلے لہجے میں پاؤں کو جھٹکتے ہوئے بولی تھی۔
”آخر ہوا کیا ہے کوئی مجھے بتائے گا۔“ اس سے پہلے اماں کچھ کہتیں، آؤرنے میں بول پڑا تھا۔
”اماں پلیز! مجھے نہ ذلیل کرو اور۔ کوئی بھی خاندان میں میرا رشتہ نہیں لے گا۔ آپ کیوں نہیں اس بات کو سمجھ رہیں۔“ اب کے مصفا کے لہجے میں لجاجت تھی۔

”کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔ میں نے تو عذرت کو دے ہی فون کیا تھا۔ کوئی رائی کا بھانڈا بتانا تو تم سے کیسے مصفا۔“ اماں نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے مصفا سے کہا۔

”ہاں آپ نے پھوپھو کو فون کیا تھا اور انہیں یاد کروایا تھا۔ ان کی ایک عدد بے چاری یتیم اور لاوارث بیٹی بھی ہے۔ تائی اور چچی تو غیر ہیں۔ کم سے کم تم ہی کچھ اپنے خون کے بارے میں سوچو لو۔ آخر کو مصفا میں خون تو تمہارے مرحوم بھائی کا ہی ہے۔ نہیں کہا تھا آپ نے ان سے۔“ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ اس بات پہ اماں لیک دم چپ سی ہو گئی تھیں۔

”اماں! میں آپ کو بتا رہی ہوں۔ اگر آپ باز نہ آئیں۔ میں کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔“ مصفا نے انگلی اٹھا کر اماں کو وارن کیا۔ ”تو اماں نے زمین پہ پڑا جوتا اٹھا کر مصفا کو دے مارا تھا۔

”بے غیرت کہتے ہوئے تجھے جیانہ آئی۔ دفع ہو جاؤ میرے سائے سے۔“ اماں نے جلال میں کہا۔ تو مصفا زمین پر پاؤں بچتی کرے میں واپس جا

چکی تھی۔ آؤرنے ایک نگاہ اماں کے تھکے ہوئے چہرے پہ ڈالی۔ اور بتا کچھ کہے واپس چلا آیا تھا۔
”کتنے کے لیے کیا تھا نہ ایک حرف تسلی کا۔ نہ ایک جگنو امید کا۔ آؤرنے کے جانے کے بعد جانے کیوں اماں منہ پہ دو ہنڈا ڈال کر رونے لگی تھیں۔

”بے بسی بھی کیا عجب شے ہے۔ جیتے جاتے انسان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر رکھ دیتی ہے۔ نہ انسان کو سانس آتا ہے۔ اور نہ ہی نکلنے کا سہارا ملتا ہے۔ وہ تو بس زندگی کے سمندر کی موجوں میں تھیرے کھاتا چلا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کل اماں خود کو بے بس تصور کر رہی تھی۔ مصفا خود کو بے چارگی کی آخری تہ میں گرئی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ آؤرنے اپنے وجود کو بے رحم موجوں کے رحم و کرم پر محسوس کر رہا تھا۔

”آہ یہ زندگی بھی ناگہبی بھی سب دے کے چھین لیتی ہے۔ تو بھی چھین کر سب دینے پر مصر ہوئی ہے۔ جانے کب اس زندگی کو قرار آتا تھا۔ کب ڈوبنے کو کنارہ ملتا تھا۔ جانے کب؟ بنی آدم ازل سے اس“ کب“ سے بے خبر ٹھہرا تھا۔ اور دم آخر تک بے خبری رہتا ہے۔ یہ تو تقدیر ہے جس کا جب دل چاہتا ہے جھولی بھر جاتی ہے۔ مصفا کی زندگی کی جھولی بھرنی تھی یا پھر وہ ہمیشہ کی طرح تکی دامان رہنے والی تھی۔ اس کی کسی کو بھی خبر نہیں تھی۔ کسی کو بھی نہیں۔

☆☆☆

”واہ اماں! اعجاز بھائی اور صوفیہ بھابھی نے رشتہ طے کرتے وقت ہم سے پوچھا اور مشورہ کرنا تک گوارا نہیں کیا۔ ڈائریکٹ آؤرنے کی شادی کا کارڈ ارسال کر دیا۔ ایسی بھی کیا بے اعتنائی ہے۔ جو بلانا بھی گوارا نہ کیا۔“ مدحت فون پہ ماں کے سائے اپنی ناراضی نکال رہی تھی۔

”اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ان کا بیٹا ہے ان کی مرضی۔ جو ٹھیک لگا جیسے ٹھیک لگا کر لیا۔“ اماں نے اس کی شکوؤں پہ اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

”پھر بھی اماں، آپ کو تو ہمیں بتانا چاہیے تھا۔ ہماری تو جیسے بھائیوں کی نظروں میں کوئی دبیو ہی نہیں ہے۔ یقین نہیں آتا اماں، یہ وہی بھائی ہیں جو اپنی چھوٹی بہنوں پہ جان چھڑکتے تھے۔ یاد رہی بھائی تو چلو دنیا میں نہیں۔ اعجاز بھائی اور کمال بھائی نے ہمیں اس دنیا میں جیتے جی مار رکھا ہے۔ چھوٹی بھابھی صاحبہ اپنی بیٹی سے رشتہ طے کیے بیٹھی ہیں۔ آپ کے جیسی خوش قسمت ترین بہو میں اس روئے زمین پر کہیں نہیں ملیں گی۔ جنہیں نہ ساس کی مرضی اور اجازت کی پروا ہے۔ اور نہ ہی تندوں کا کوئی بار۔ جو دل میں آتا ہے کرتی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں۔ چھوٹیں جیسے سال گزارنے کے بعد بھی ساس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ سر اثبات میں مل گیا تو وہ کام کر لیا۔ دامیں سے پائیں نہیں کی تو وہیں چپکے ہو کر بیٹھ گئے۔“

مدحت کے شکوے تو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اماں نے اب کے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

”بھڑے پرے سرال میں ہماری بھی کوئی عزت ہے کہ ہمیں غیروں کی طرح کارڈ بھجوا دیا۔ آپ بھی انہیں کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے سب دیکھتی رہتی ہیں۔“

”مدحت! میں نے جس کام کے لیے فون کیا میں وہ بات کر لوں۔“ اس سے زیادہ صبر اب اماں میں نہیں تھا۔

”اماں! آپ ہمیشہ.....“ مدحت نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

”مدحت! یہ تمہارا اور تمہارے بھائیوں کا معاملہ ہے۔ میں نے کب منع کیا تمہیں ان سے شکوے نہ کرنے سے۔ اور یوں بھی بیٹا میرے کہنے کا فائدہ تو تب ہو جب کوئی سنے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تمہارے دونوں بھائی ماں سے زیادہ اپنی بیویوں کی سنتے ہیں تو میں نے بھی عرصہ دراز سے انہیں سننا چھوڑ دیا ہے۔ میرے کندھوں پہ تمہارے مرحوم بھائی

کی ایک ذمہ داری ہے۔ مجھے اب بس اس کے فرض سے سبکدوش ہونے کی فکر ہے۔“ اماں کی بات پہ مدحت خاموش ہو گئی تھی۔
”یہ بات میرے کہنے کی نہیں ہے۔ اس بات کا خیال تم سب کو خود ہونا چاہیے۔ مصفا ہماری ذمہ داری ہے۔ بلکہ ہم سب کی۔ میں یہ چاہ رہی ہوں۔ تم عذرت سے بات کرو کہ اگر وہ.....“ اماں نے بات کو ادھورا چھوڑا تھا۔ لیکن مدحت ماں کے دل کی بات اور لہجوں پہ ٹھہری ادھوری بات کا مفہوم سمجھ چکی تھی۔
”اماں! اسی بات کا تو رونا رو رہی ہوں۔ یتیم اور اسکی بیٹی کسی کو نظر نہیں آتی۔ دونوں بھائیوں کا فرض بنتا تھا۔ اگر اعجاز بھائی نے مصفا کا رشتہ نہیں لیا۔ تو کم سے کم کمال بھائی کو شرم آتی چاہیے تھی۔“ مدحت کا غصہ پھر سے عود آیا تھا۔

”میں اپنی زندگی میں مصفا کے فرض سے ادا ہونا چاہتی ہوں۔ میری زندگی میں یہ حال ہے بچی، اپنوں کے ہوتے ہوئے اتنی تنہا ہے۔ بعد میں اس کا کیا حال ہوگا۔ تم عذرت سے بات کرو۔ اگر وہ اپنے بیٹے کے لیے مصفا کے لیے راضی ہے۔ تو آؤرنے شادی میں سب رشتہ دار اکٹھے ہوں گے۔ میں مصفا کا فرض ادا کرنا چاہتی ہوں، نکاح کر دوں گی۔ باقی جو کچھ کرنا ہوا وہ عذرت جیسے مرضی کرے۔“ اماں نے اپنے دل کی بات بیٹی کے سامنے کھول کر رکھ دی۔

”ارے اماں! آپ تو تسلی پر سرسوں بجانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں آپا سے بات کر رہی ہوں اور بالفرض اگر وہ مصفا کا رشتہ لینے پہ راضی ہو گئیں تو بھی وہ اس طرح سادگی سے نکاح پہ کہاں راضی ہوں گی۔ ہتا تو ہے آپ کو ان کے سرال والوں کا ظاہری شوشا پہ جان دینے والے لوگ ہیں۔ خیر یہ تو بعد کی بات ہے پہلے رشتہ تو طے ہو جائے۔ میں آپا سے ایک دو دن میں بات کرتی ہوں۔ اور پھر آپ کو بتاتی ہوں آپ فکر نہ کریں اللہ سب اچھا کرے گا۔“ ماں کو یوں پریشان دیکھ کر مدحت نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ تو اماں نے فون رکھ دیا۔

جانے کیوں آذر کو کھونے کا قفس دل میں گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ حالانکہ دن میں کتنی بار وہ اپنے اس خیال کو جھٹکتی تھیں اور ڈھیروں خوشیوں کی دعا میں بھی کرتی تھیں۔ لیکن پھر بھی جانے کیوں ہر بار مصفا کو دیکھنے کے بعد ان کے دل کا قفس یونہی بڑھتا جاتا تھا۔

☆☆☆

آج کل کرتے کرتے آذر کی شادی سر پہ آگئی تھی۔ سب ہی مہمان بعد پھوپھو میوں کے وارو ہو چکے تھے۔ آذر کی مہندی والے دن بھی اشارے کنایوں میں مدحت سے عذرت کا خیال جاننے کی کوشش کی تھی۔

”اماں! آذر کی شادی سے فارغ ہو لیں۔ پھر بیٹہ کی بات کر لیں گے۔ آپ آج آپ سے بھی کوئی بات نہ کرنا چاہی۔“ مدحت نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ تو اماں مدحت کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔

ان کے کمرے میں آج کل بیٹیوں کا قبضہ تھا۔ اور مصفا دوسرے کمرے میں تھیں جانے کیا کرتی رہتی تھی۔ مدحت کے پاس سے اٹھ کر اماں، مصفا کو آوازیں دیتے ہوئے دوسرے کمرے میں آئیں۔ تو سامنے مکمل اوڑھے لیٹی مصفا کو دیکھ کر اماں کا پارہ ہائی ہو گیا۔ ”سچ کر اس پر سے مکمل ہٹایا۔ اور وہ بے نقط سالی کہ مصفا روہی ہوئی۔“

”گھر مہمانوں سے بھر پڑا ہے۔ ان کے پاس بیٹھے باتیں کرنے کے بجائے تم یہاں سرمہ لپٹے بیٹھی ہو۔ جانتی بھی ہو سب لوگ بعد میں کیا کیا باتیں کریں گے۔ لیکن تمہیں کیا۔ ساری پریشانیاں اور فکریں تو بس مجھے پورھی جان کو ہیں۔ باقی سب تو سکون میں ہیں۔“

اماں بیٹہ پہ بیٹھے ہوئے بولتی جا رہی تھیں۔ جب وہ اچانک سے اپنی جگہ سے اٹھی اور زمین پہ بیٹھ کر اپنا سر اماں کی گود میں رکھ دیا تھا۔ اماں نے جیسے ہی اسے پرے کرنے کے لیے اس کے جسم کو ہاتھ لگایا تھا۔ فوراً ہی پرے ہٹا لیا تھا اس کا جسم تپ رہا تھا۔ وہ

تیز بخار میں جل رہی تھی۔

”مصفا۔“ اماں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور اس کے بالوں پر اپنے لیوں کو رکھ دیا۔ ”اماں کی جان کو اتنا تیز بخار ہو رہا ہے۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔“

اماں نے اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔ ”وہ کچھ بھی بتا کہے اماں کے گلے میں بائیس ڈال کر لپٹ گئی تھی۔ اسے خود سے الگ کرنے اور بستر پر لٹانے کے بعد اماں نے ٹمینہ کام والی سے چائے بخوائی اور ساتھ میں ٹیکٹ اور ٹیکٹ منگوا کر زبردستی مصفا کو کھلائی۔ بدلتا موسم اس پہ یونہی اثر انداز ہوتا تھا۔ آتی سردیاں آنے سے پہلے ہی اسے اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ اماں کو کیا خبر تھی اس بار سردیاں نہیں تنہا بھر الپج اور خضر بھر اندازہ اسے اندر تک چھ کر رکھ گیا تھا۔“

صبح کی ہی تو بات تھی۔ بھی کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کی۔ اماں ساتھ والے کمرے میں تھی ہوئی تھیں۔ مصفا کام والی سے مصفا کی کروانے میں مصروف تھی۔ جب وہ اماں کے کمرے کے پاس سے گزری اودھ کھلے دروازے سے مدحت اور عذرت کی آوازیں بآسانی سنی جا سکتی تھیں۔

”اماں سے کہہ دو۔ اس بات کو پھر سے نہ دہرائیں۔ میں نے تمہارے بہنوئی سے بات کرنے کی کوشش کی۔ مصفا کا نام سننے ہی تو ذہنی طور پر جھک گئے تھے۔ کہنے لگے تم نے سوچا بھی کیسے میرے بیٹے کے لیے مصفا کا۔ اور آج کیوں تمہارے خد کرنے پر میں نے ان سے بات کی تھی۔ در نہ میں نے تو خود بھی مصفا کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ بے شک۔“

مصفا کی تربیت اماں نے کی ہے۔ لیکن وہ کیا کہتے ہیں نا۔ خون اور دودھ اپنا اثر ضرور دکھاتے ہیں۔ جیسی ماں ویسی بیٹی۔ یہ مشہور کہاوت یونہی مشہور نہیں ہوئی۔ میں تو بھی اپنے بیٹے کو اس مصیبت میں نہ ڈالوں۔ جس میں یاد رہا تھا جیلا

ہوئے تھے۔ میری طرف سے مصفا کے لیے صاف جواب ہے۔ میں تو جمال کے لیے عشق کے بارے میں سوچے بیٹھی ہوں۔ اور اس بات سے تمہارے بھائی کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اور پھر بھی تمہیں اگر مصفا سے زیادہ عیاں ہر دوری ہو رہی ہے۔ تمہارے اپنے دو بیٹے بھی تو مصفا سے عمر میں بڑے ہیں۔ تم ان میں سے کسی ایک کے بارے میں سوچ لو۔“ عذرت نے صاف انکار کے ساتھ چھوٹی بہن کو وہ راستہ دکھایا جس سے وہ خود نظریں چوائے بیٹھی تھی۔

”حبيب نے مجھ سے حرا کے بارے میں بات کی ہے۔“ بھائیوں سے دھیروں شکوے اور شکایتیں رکھنے والی بیٹیں انہی کی نشیاں لینے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں۔ عذرت کے چہرے پہ استہزاء مسکراہٹ ابھری تھی۔ تو مدحت بے اختیار سرمہ بند ہو گئی۔

”مصفا بھی گھر کی بیٹی ہے۔ لیکن اس کی ماں نے جو کیا لوگ آج بھی نہیں بھولے ہیں آپا، میں اپنے بیٹے کو ایک امتحان مسلسل میں کیسے ڈال دوں۔“ سچ تو یہ ہے مصفا کو دیکھتے ہی اس کی ماں کے کارنامے خود بخود یاد آنے لگتے ہیں تو دل میں مصفا کے لیے ابھن سی ہونے لگتی ہے۔ اماں کو چاہیے اس کا خاندان میں رشتہ ڈھونڈنے کے بجائے کسی باہر والے لڑکے سے دیکھ بھال کر ملے کر دیں جسے مصفا کی ماں کے ماضی کی کوئی خبر نہ ہو۔ جانتے بوجھتے کوئی بھی مصفا کا رشتہ نہیں لگا۔“

مدحت نے اپنے تئیں حل نکال کر رکھا تھا۔ باہر کھڑی مصفا کو اپنی روح اور جسم میں موجود دل نامی ٹکڑے پر بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”جیسی ماں ویسی بیٹی دودھ کا اثر ضرور ہوتا ہے۔“ مصفا آنکھوں میں آنسو لیے وہاں سے ہٹی اور یہاں آکر رو پڑی تھی۔ دیکھ، اذیت بخار کی صورت اس کے جسم سے لپٹ گئی تھی۔ آخر کیوں ہر بار اس کی

ذات کو اس حوالے سے جوڑا جاتا ہے۔ جسے اس نے کبھی اپنی ہوش میں نہیں دیکھا تھا۔ ہاں وہ عورت اسے پیدا کرنے کا وسیلہ ضروری تھی۔ باقی اس نے تو کبھی اس عورت کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ جو اسے دنیا میں لائی تھی۔ اس نے تو ماں کی شکل میں اپنی وادی کو دیکھا تھا۔ سر اپنا محبت بیٹوں کی ہر زیادتی پر یوں آنکھیں بند کرتی تھیں۔ جیسے انہوں نے کچھ نہیں دیکھا ہو۔ محبت لٹائیں، رشتوں پہ جان دیتیں رشتوں کو جوڑ کر رکھنے والیں۔ اس میں اس نے کئی بار اماں کو اپنی ذات کی نشی کرتے بھی دیکھا تھا۔ اماں جیسی وقار شعار، سلق مند عورت کے ہاتھوں میں مصفا کی پرورش ہوئی تھی۔ تو پھر وہ کیسے اپنی ماں جیسی ہو سکتی تھی۔

چند ماہ کی مصفا کو بیس سال کا اماں نے کیا تھا کیوں اس کی ذات کے ساتھ اماں کا حوالہ نہیں لگایا جاتا تھا۔ اس کی ماں تو اماں تھیں۔ دو عورت جس نے زندگی میں اپنے رشتوں سے زیادہ کبھی کسی چیز کو اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن پھر بھی اسے ان سے الگ کر کے اس کے ساتھ جوڑ دیا جاتا تھا۔ کیوں۔ آخر کیوں؟

اسے یہ سوچتے سوچتے اور روتے ہوئے دوپہر سے شام ہو گئی تھی۔ لیکن وہ اس کیوں کا جواب نہیں پاسکتی تھی۔ یوں بھی ایسے سوالوں کے جواب ہمارے پاس نہیں۔ بلکہ دنیا کے پاس ہوتے ہیں۔ جو اکثر خطرناک پھر مسخر میں لپیٹ کر ہمارے منہ پہ مارتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح عذرت اور مدحت نے مصفا کو پوری قوت سے منہ کے بل گرا دیا تھا۔ اور وہ ان کی باتیں سن کر کتنے ٹکڑوں میں ٹٹی تھی۔ اس کی کسی کو خبر تھی اور نہ ہی پر اسوائے اماں کے جو اسے ہاسپٹل لے جا رہی تھیں۔ بخار کی شدت کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے یوں ہاسپٹل جانے اور بیمار ہونے سے سوائے آذر کے کسی کو بھی کوئی فرق نہیں

پڑا تھا۔ اگر فرق پڑا تھا تو اماں کی غیر موجودگی کا فرق پڑ رہا تھا۔ مہندی کے فنکشن میں ہر کوئی اماں کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ اور پھر مجبوراً چہرے پہ اداسی بھرے تاثرات کو سجائے مصفا کی اچانک طبیعت جو کہ فوڈ پوائزنگ کا شائنہ تھی بتا کر مجبوری کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ جیسے ہی آذر اپنی مہندی کے فنکشن سے فارغ ہوا تھا۔ اماں کے پاس چلا آیا تھا۔ وہ دو ایوں کے زیر اثر سو رہی تھی اور اماں اماں تو آذر کو دیکھتے ہی خود پر قابو نہیں رکھ سکتی تھیں۔

”اماں! آپ بھی نا۔ بچے تیار ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مصفا تو ذرا سے بدلتے موسم کی جھٹ میں آتی ہے۔ اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔ داوی کو اپنے چوڑے سینے سے لگائے وہ تسلیاں دے رہا تھا۔

کسی اپنے شخص کا ساتھ ہونا بھی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ اماں مصفا کے لیے اپنوں کی بے گنجی اور بے اعتنائی پہ سخت مضطرب تھیں۔ انہیں بار بار یہ خیال آذر کو دیکھ کر اور بھی تنگ کر رہا تھا کہ کیوں انہیں نے آذر اور مصفا کی شادی کے لیے جتنی سے کام نہ لیا تھا۔

شاید تب ان کے دل میں کہیں تا کہیں یہ خیال تھا۔ پوتے تانسی چہرہ اوسوں میں سے کوئی ایک مصفا کا نصیب بن جائے گا۔ لیکن، افسردگی سے سوچے ہوئے اماں آذر کو دیکھتی تھیں۔ جو راتوں پانے والے ڈاکٹر سے مصفا کی طبیعت کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

”اب تو بہت بہتر ہیں۔ آپ انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔“ اور پھر یوں صبح کے چار بجے آذر، اماں اور مصفا کو گھر لے آیا تھا۔

”شمینہ لی! مصفا کے لیے کچھ کھانے کے لیے لائیں۔“ مصفا کو سہارا دے کر بیڈ پر لٹانے کے بعد اس نے شمینہ بی سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر جا چکی تھیں۔ آذر اب اماں کو بی بی کی ٹیبلٹ کھلا رہا تھا۔ جب اماں نے اسے جا کر

آرام کرنے کا کہا۔

”کل تمہاری زندگی کا ایک بہت اہم دن ہے۔ تم بھی جا کر آرام کرو۔“ اماں نے ٹیبلٹ کھانے کے بعد محبت پاش نظروں سے پوتے کو قربان ہو جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”کروں گا آرام بھی۔ یوں بھی بارات رات کی ہے۔ آپ غرمت کریں۔“ آذر نے اماں سے کہا اور پھر اپنی جانب دیکھتی مصفا کی طرف دیکھا جو اسے دیکھتے ہی سرعت سے اپنی آنکھوں کو پھر سے بند کر چکی تھی۔

”اب کیسی طبیعت ہے مصفا؟“ آذر نے اسے مخاطب کیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ دو لفظی حرف بولنے کے بعد رخ بدل گئی تھی۔

آذر نے گہرا سانس لیا اور اپنے ہاتھ میں موجود فن کی روشن اسکرین کو دیکھنے لگا۔ جس پہ اس کی ماں کی کال آ رہی تھی۔ جانے کیوں آج اسے اپنی ماں کی بے حس یہ غصہ آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھیں مصفا اور اماں ہاسپٹل سے گھر آ چکی ہیں۔ ان کا پتا کرنے کے بجائے وہ اسے ”جلدی سے گھر آ جاؤ۔“ کے میسج کر رہی تھیں۔ اور اس عجیب بے حس میں وہ اکیلی تھیں۔ چچی کے ساتھ ساتھ دونوں پھوپھیاں بھی شامل تھیں۔ پہلی بار آذر کو مصفا کی قسمت پہ ترس آ رہا تھا۔ ماں باپ، بہن بھائی بڑی نعمت اور انسان کی حالت ہوتے ہیں۔ آج اگر مصفا کے والدین یا پھر کوئی بہن بھائی ہوتا۔ وہ آج اس طرح اکیلی اور تنہا نہیں ہوتی۔ دکھ سے آذر کا دل بھرنا جا رہا تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ کچھ دیر اور ان کے پاس پہنچنے کے بعد وہ اپنے گھر آ گیا تھا۔ آنکھیں بند کرنے تک اسے مصفا کے لیے دکھ ہوتا رہا تھا۔ بے حد، بے انتہا۔

☆☆☆

خوشیاں تو جیسے احمد ہاؤس کی مکین بن بیٹھی تھیں۔ رنگ دیو کا ایک سیلاب تھا جو ساتھ گھر میں اتر آیا تھا۔ ہنسی قہقہوں کی آواز جیسے کان کے پردے

پھاڑنے کے درپے تھی۔ بس ایک ہی تھی جو خالی ذہن اور خالی نظروں کے ساتھ اماں کو تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ آذر کی ایک ہی خند تھی۔ اماں اس کے ساتھ بارات میں جائیں گی تو وہ تب ہی بارات لے کر جائے گا۔

اس کی ضد کے سامنے اماں کو ہارنا ہی پڑا تھا۔ یوں تو آذر نے مصفا سے بھی تین چار بار تیار ہونے اور ساتھ چلنے کا کہا تھا لیکن اس نے ہولے سے ہر بار سر ہٹنے کے اعزاز میں ملا دیا تھا۔

”کوئی بات ہے مصفا، کسی نے کچھ کہا ہے؟“ آذر کا دل اس کی خاموشی اور حالت دیکھ کر کٹ رہا تھا۔ اور آذر کی یہ فکر مندی صوفیہ بیگم کو ایک آنکھ بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

”تھک گئی ہوں۔ میں آرام کروں گی۔“ مصفا نے کہنے کے بعد یوں کوڑا سا پھیرا دیا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے، اماں آجائیں گی۔ تم تو تیار ہو جاؤ۔“ صوفیہ نے سینے کا بازو تھاما تو آذر نے اماں کی طرف دیکھا جو اثبات میں سر ہلا کر اسے ساتھ چلنے کا عندیہ دے رہی تھیں۔

”میں جلدی آ جاؤں گی۔ تم فکرتا کرنا شمینہ بی تمہارے پاس ہیں۔“ اماں بلا مبالغہ کوئی تیسری بار اسے تسلی دینے پر بار بار اس کے پاس آتی تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں اماں، آپ جائیں۔“ ان کی اتنی محبت پہ مصفا کا دل بھر آیا تھا۔ اس نے نماں کا تھ تھاما اور ان کے ہاتھ کی پشت پہ ہوسہ دے ڈالا تھا۔

اماں اس کی محبت پہ مسکرائیں اور پھر مطمئن ہونے کے بعد باہر کھڑی آذر کی گاڑی میں آ بیٹھی تھیں۔

اماں تو کچھ دیر کے بعد ہی گھر واپس آنا چاہتیں تھیں۔ لیکن آذر نے انہیں اس سے اترنے ہی نہیں لیا۔ اور یوں تین گھنٹے کے طویل فنکشن کے بعد وہ فزا وانی زندگی میں شامل کر کے اپنے ہمراہ رخصت کروا کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ پوتے کو نئی زندگی کی

ڈھیروں دعا میں دیتے ہوئے جب اماں گھر واپس آئی تھیں تو مصفا گہری نیند سو رہی تھی۔ اماں نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر بخار چیک کیا۔ اور شمینہ سے ”مصفا نے کچھ کھایا تھا۔“ پوچھ کر کمرے سے باہر نکل آئی تھیں۔ جہاں ان کی بیٹیاں منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔

”اماں! یہ زیادتی ہے، کتنے سال کے بعد میں آئی ہوں۔ مجھ سے بات کرنے دل کا حال پوچھنے کے بجائے آپ پوتی کی دلی جونی میں تو بھی اس کی تجارت داری میں مصروف ہیں۔“ مدحت کے شکوے بھی ختم نہیں ہونے تھے۔

”مصفا بیمار ہے مدحت۔“ اماں بہت تھک گئی تھیں۔ لیکن وہاں پروا کسے تھی۔

”اچھا میری بات سن لیں۔ پھر بعد میں نہ کہنے لگ جائے گا اور پھر ہی اوپر سب طے کر لیں۔ میں انجائز بھائی بے حق کا رشتہ مانتے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اور۔۔۔۔۔“ اس سے پہلے مدحت حریف کچھ کہتی، اماں اپنے دونوں کھنٹوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھیں۔

”اور عدالت۔“ حقنا حرا کا رشتہ مانتے کا ارادہ رکھتی ہوگی۔ اچھی بات ہے بہت اچھی بات ہے۔ سب جو کر رہے ہیں۔ بہت اچھا کر رہے ہیں۔“ اماں بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں آئیں۔ اور مصفا کے ساتھ آ کر لیٹ گئیں۔ وہ اب کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھیں۔ کیونکہ ان کی فرماں بردار اولاد ان کی ہر سوچ، ہر بات کو بے کار سمجھ کر نظر انداز کیے جا رہی تھی۔ وہ سخت بھول تھیں۔ اور بے حد اداس بھی۔ انہیں اب مصفا پہ نہیں بلکہ خود پہ ترس آ رہا تھا۔ وہ جتنی جلدی مصفا کے لیے کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھیں۔ اتنی ہی دیر ہوئی جا رہی تھی۔ اور وہ اتنی ہی ناامید بھی ہو رہی تھیں۔

کاش یا اور خود زندہ ہوتا تو انہیں کیوں اتنی فکریں لاحق ہوتیں۔ آنسو اب ان کی یوزمی آنکھوں سے نکل کر ان کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔

ہم کہتے بھی طول، اداس اور خود کو بے بس تصور کیوں کرتے ہوں۔ لیکن دنیا کو دکھانے کے لیے ہمیں اپنے دکھوں، غمروں اور بے بسی کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر دنیا کے سامنے مسکراتا ہی پڑتا ہے۔ مصفا تو کیا خود آج اماں بھی آؤر کے ویسے کی تقریب میں شامل نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ اولاد کی بے جسی اور نافرمانی نے انہیں اندر تک توڑ کر رکھ دیا تھا۔ لیکن پھر وہی بات دنیا کیا کہے گی، دنیا کیا سوچے گی، دنیا کیا سمجھے گی، کی بات سے ڈر کر نہ صرف اماں بلکہ مصفا بھی آؤر کے ویسے کی تقریب میں شامل تھی۔ اماں کو آتا دیکھ کر آؤر جلدی سے اس سے اتر اور ان کے قریب آ گیا۔ بلیک قمیڑیں سوٹ میں ملیوں آؤر نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہا تھا۔ وہ مردانہ وجاہت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اور اس مستزاد اس کی عادتیں تھیں جو راہ چلتوں کو بھی اپنا بتا جاتی تھیں۔ فرا جو پہلے ہی آؤر پر فریفتہ تھی۔ ایک ہی دن میں آؤر نے یہی طرح دل ہار لی تھی۔

دوسروں کے ساتھ غلط نہ کرنے والا اپنی بیوی کے ساتھ کسے غلط کر سکتا تھا۔ آؤر خود مطمئن تھا یا نہیں۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن فرا کے چہرے کی چمک اور خوشی بتا رہی تھی۔ آؤر سے وہ کتنی مطمئن اور خوش تھی۔

”کیسی ہو مصفا۔ طبیعت ٹھیک ہے۔“ اماں سے حال احوال پوچھنے کے بعد آؤر نے مصفا کو مخاطب کیا۔ جو اسے دیکھ کر اپنے ساتھ شوق اور حرا کو اکھیلیاں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے اپنی نظروں کو فرا کے وجود سے ہٹایا اور سر جھکا لیا تھا۔

اس سے پہلے کہ آؤر مزید کچھ کہتا، صوفیہ بیگم قریب آئی تھیں اور زبردستی آؤر کے ساتھ ساتھ اماں کو بھی اپنے ہمراہ اسے لے گئی تھیں۔ مصفا اپنے ہاتھوں کی اگلیوں کو سکی وہاں سے ہٹ کر کونے میں لگی نیل کی کرسی کی بجائے بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس خاندان کا

سب سے قاتلو پرزہ تھی۔ اور اس نے اپنے حقیقت کو مان بھی لیا۔ وہ اب بے تاثر نظروں سے اپنے ارد گرد موجود خوشی سے لبریز چہروں کو دیکھ رہی تھی۔ جب اس کے قریب ایک آواز ابھری تھی۔ اس نے اپنی گردن کو گھمایا۔ اور استفسار سے نظروں کو وارو کو دیکھنے لگی تھی۔

”میں نیل ہوں۔ ڈاکٹر نیل۔ آپ یاؤر کا کی بیٹی ہو؟“ پر شوق نظروں سے دیکھتے ہوئے اس سے سوال کر رہا تھا۔ اور مصفا کا بس نہیں چل تھا۔ وہ چمکی بجا کر یہاں سے عتاب ہو جائے۔ مصفا نے بے زاری سے اپنے قریب کھڑے لڑکے کو سرسری سے انداز میں دیکھا اور پھر کھڑے کر اماں کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی۔

”خدیجہ دادی تو ادھر ہیں۔ میری دادی پاس۔“ تو وارو اسے اس کے ہاتھوں کو ڈھونڈتے دیکھ کر دوسری سمت اشارہ کر کے بولا۔ اس بار مصفا نے جانے والی نظروں سے اس لڑکے کی طرف دیکھا۔ اپنا نام ڈاکٹر نیل بتا رہا تھا۔ اس سے پہلے روتے کہنے کے لیے منہ کھولتی وہ ایک بار پھر سے بول تھا۔

”مجھے خدیجہ دادی نے ہی کہا تھا کہ تمہیں لاؤں، ان کے بغیر پریشان ہو رہی ہوگی۔“

”آپ کو تمیز نہیں ہے انجان لوگوں سے بار کرنے کی۔ تم یہ تم کیا ہوتا ہے۔ مجھے سے تمیز بات کریں۔“ وہ اسے غصے سے لڑائی اس جانمہان بھی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے پلیٹ گئی جہاں اس نے دادی کے ہونے کا اشارہ کیا تھا۔ وہاں بہت سے لوگوں میں اماں گھری ہوئی تھیں۔ اور ہنس کر باتیں بھی کر رہی تھیں۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بنا کسی کو مخاطب مشترکہ سلام کیا۔ ”والسلام۔ یہ تو بالکل یاد رکھی کا پی ہے۔“ خاتون جو کہ تقریباً دادی کی ہم عمر ہوں گی۔ آگے بڑھ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی تھیں۔

آج کل اسے اپنے ماں باپ کا ذکر بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جیسا کہ اس کا آف موڈ مزید خراب ہو گیا تھا۔

”اماں اچھے گھر جانا ہے۔“ اس نے بے زاری سے بھرے لہجے میں کہا۔ اور اماں کے گھومنے کی بھی رتی بھر پروا نہیں کی تھی۔

”طبع ذرا خراب ہے نا تو آج کل ذرا چڑھی ہو گئی ہے۔“ اماں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اور پھر باج منٹ کہتے کہتے پورا فنکشن ہی ان کے ساتھ باتوں میں مصروف رہی تھیں۔ البتہ مصفا اپنے کان اور آنکھیں بھی ہونے کے باوجود یوں شخص کے انداز میں بیٹھی رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی اور بہری ہو۔ ایک دو بار کسی نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن پھر اس کا موڈ دیکھتے ہوئے وہ لڑکی جیسے ہو کر کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

گھر آنے کے بعد وہ اماں سے سخت ناراض تھی۔ تو وہیں اماں اس کی سرعام پٹختری پہ اس سے سخت تنہا تھیں۔ اور پھر دادی پوئی دونوں ہی ایک دوسرے سے ناراض ہونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔

☆☆☆

شادی کی رونقیں مانتے پڑ چکی تھیں۔ آؤر، فرا کے ہمراہ اپنے بیٹی ہونے پر بے جا چکا تھا۔ تو وہی سب بات کریں۔ ”وہ اسے غصے سے لڑائی اس جانمہان بھی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے پلیٹ گئی جہاں اس نے دادی کے ہونے کا اشارہ کیا تھا۔ وہاں بہت سے لوگوں میں اماں گھری ہوئی تھیں۔ اور ہنس کر باتیں بھی کر رہی تھیں۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بنا کسی کو مخاطب مشترکہ سلام کیا۔ ”والسلام۔ یہ تو بالکل یاد رکھی کا پی ہے۔“ خاتون جو کہ تقریباً دادی کی ہم عمر ہوں گی۔ آگے بڑھ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی تھیں۔

کی ڈانٹ سنتی رہتی یا پھر کتابوں میں منہ دے کر بیٹھی رہتی۔

یہ نہیں تھا خاندان سے باہر رشتے نہیں ملے تھے۔ کئی لوگوں نے خود مصفا کے رشتے کے لیے ان سے بات کی تھی۔

لیکن بس وہ ڈرتی تھیں۔ دنیا بڑی عالم ہے اور وہ مصفا کو اس ظالم دنیا کے ہاتھوں میں دینے کے بجائے انہوں کی چھاؤں دینا چاہتی تھیں۔ کہتے ہیں اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے۔

انہوں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتی مصفا کو دیکھا۔ جو سامنے ہی لاؤنچ کے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے پوری شدت سے رو دی تھیں۔

”کاش، تم ایک بار سوچ لیتیں، تمہارا یہ ایک قدم تمہاری اپنی کوکھ سے پیدا ہوئی بیٹی ہے۔ کیا اثر کرے گا۔ تمہارا حوالہ اس کے لیے ایک طعنہ بنا دیا جائے گا۔ تم سے پیدا ہونا اس کا حرم بنا دیا جائے گا۔ کاش تم سوچ لیتیں، تو آج مصفا کو یوں ڈنسل وروانہ ہونا پڑتا۔“

کتنے ہی کاش اماں کے لیزوں سے نکلے تھے۔ اور پھر وہیں دم بھی توڑ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے پر پھیلے آنسوؤں کو صاف کیا۔ اور رشتہ کروانے والی عورت کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔ جب یہ ملے تھا خاندان میں کوئی بھی مصفا کا رشتہ نہیں لے گا۔ تو پھر انتظار کرنا فضول تھا چاروں بچوں سے ناامید ہونے کے بعد انہوں نے ٹھیکہ بوا سے مصفا کے رشتے کی بات کی۔ اور جلد ہی انہیں کوئی اچھا رشتہ لانے کی ہدایات دیتے ہوئے فون بند کر کے وہ بیڈ پر آ بیٹھی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا ایک ایسی مسافت طے کر کے آئی ہوں۔ اور منزل بھی نہ ملی ہو۔

☆☆☆

ٹھیکہ بوا تو دونوں کے بعد ہی مصفا کو دکھانے کے لیے اپنے ساتھ دو خواتین کو لے آئی تھیں۔ تیز رنگ کے کپڑے پہنے تیز میک اپ اور بہت سارے

سونے سے لدی بھدی وہ دونوں خواتین دیکھنے والوں پہ کچھ اچھا تاثر نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ ہر بات پیسے سے شروع ہو کر پیسے پہ ختم ہو رہی تھی۔ اماں اپنی دونوں بہنوں کے سامنے شرمندگی سے پانی پانی ہو رہی تھیں۔ کیونکہ دونوں کے چہروں پہ ہی طنزیہ مسکراہٹ آویزاں تھیں۔

”لڑکی کو تو بلا دیں۔“ کھانے سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے بالآخر انہیں، مصفا کا خیال آ ہی گیا تھا۔ اماں نے بادل تا خواست اثبات میں سر بلایا اور تمینہ بی سے مصفا کو بلانے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی مصفا آئی۔ ان دونوں خواتین کے چہرے پہ سانس بھری مسکراہٹ ابھری تھی۔

”ہمارا بھائی بھی لاکھوں میں ایک ہے۔ ماشاء اللہ کماؤ اور اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ وہ تو اس کی پہلی بیوی ہی بد ذات نکلی تھی۔ لے کر الزام لگا کر بچی کو ساتھ لے کر چلتی تھی۔“

وہ عورت شکیلہ بوا کے گھورنے اور اشارے کنایوں کو یکسر نظر انداز کرتی بوٹی جا رہی تھی۔ تو وہیں حرمت سے اماں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ انہوں نے ایک شکوہ بھری نظر شکیلہ بوا کی ڈالی تھی۔ وہ خاتون جانے کیا بھی تھیں کہ پھر سے بول اٹھی تھیں۔

”آپ فکر مت کریں۔ شکیلہ بوا نے ہمیں سب بتا دیا ہے۔ وہی جو اس لڑکی کی ماں نے کیا تھا۔ جانے کیسی عورتیں ہوتی ہیں۔ جو اپنے بچوں کو چھوڑ کر آشنائوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔ دیکھو بھئی، صاف بات ہے کہ میرا بھائی تو خود پہلے ہی ایک عورت کا ڈسا ہوا ہے۔ اب تم بھی اپنی ماں کی طرح نہ کرنا۔ ہم جانتے بوجھتے کڑوی گولی نگل رہے ہیں۔ خدا سے ڈر لگتا ہے یا پھر کہہ لو صلہ رحمی کرنے چلے آئے ہیں۔“

وہ عورت نا جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ اماں تو جیسے پتھر کا بت بنی بیٹھی تھیں۔ اور مصفا، مصفا تو یوں جیسے کاٹو تو جسم میں لہو کے مصداق دھواں دھواں چہرے کے ساتھ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روکنے

کی کوشش میں بے دردی سے اپنے لیوں کو دائروں تلے کاٹ رہی تھی۔ وہ انکی اور مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ پتا نہیں وہ عورتیں کیا کہہ رہی تھیں۔ صوفیہ بیگم نے انہیں کیا جواب دیا تھا۔ اماں کو کچھ پتا نہیں تھا۔

ان خواتین اور شکیلہ بوا کے جانے کے بعد صوفیہ بیگم، عالیہ کے ہمراہ اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ بس ایک اماں ہی تھیں اور کوٹنے میں وہی بیٹھی شینہ بی جو لاؤنچ میں بیٹھی کی بیٹی رہ گئی تھیں۔ کہنے کے لیے ایک نقطہ بھی نہ تو اماں کے پاس تھا اور نہ ہی تمینہ بی کے پاس۔ مصفا تو پہلے ہی اس منظر سے غائب ہوئی تھی۔

☆☆☆

جس وقت صوفیہ بیگم بڑبڑاتے ہوئے اپنے گھر کے ہال کمرے میں وارد ہوئی تھیں۔ سامنے ہی صوفیہ کی بیک سے ٹیک لگائے ٹانگوں کو تھیل پہ پھیلائے آؤر گود میں لیپ ٹاپ رکھے اپنے آفس کی جانب سے آئی ہوئی میلو کو چیک کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی صوفیہ کے دوسری طرف اعجاز احمد بیٹھے اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ ماں کو آتا دیکھ کر حرا اور شبنم بھی کچن سے نکل آئی تھیں۔ آخر انہیں بھی تو جس تھا مصفا کا آنے والا پروپوزل کیسا ہے۔ اور اس رشتے کا کیا ہے؟ فزا شاید ابھی تک اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ صوفیہ بیگم نے چادر اتار کر شبنم کی سمت بڑھائی اور حرا سے پانی لانے کا کہا۔

”ہاں بھئی، کیا بنا مصفا کے رشتے کا؟“ اعجاز احمد نے ان کے بیٹھے ہی اخبار کو تھ کرتے ہوئے کہا۔

”ماں بتاتی ہوں ابھی“ صوفیہ بیگم، آؤر کے سامنے ابھی کوئی بھی بات نہیں کرنا چاہتھیں۔ رات ہی تو وہ اور فزا واپس آئے تھے۔ اور انہیں چاہتی تھی دادی کی پریشانی سننے ہی وہ ان کے گفتگوں کے ساتھ لگ کر بیٹھ جائے۔ وہ بھی اس بات میں جب مدحت نے انہیں اپنے ہاں دعوت

بلانے کا عندیہ دیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ آؤر سے بات کر کے وہ آج کل میں ہی مدحت کے ہاں چکر لگا آئیں۔ لیکن اعجاز صاحب تو جیسے ان کے ہر منصوبے کو پانی پھرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کے بہرے اشارے کیے جا رہی تھیں۔ لیکن اعجاز صاحب سمجھتے تو جب تا۔

پھر سے آنے والے رشتے کا کیا پتا؟ کہہ کر ان کی طرف استفہامی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ ”بس رہنے دیں۔ آپ، آپ کی اماں نے تو پورے خاندان کو رسوا کروانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ پانی پینے کے بعد گلاس کو تھیل پہ پھینچے ہوئے صوفیہ بیگم نے قدرے غصے سے کہا تھا۔ لیپ ٹاپ پہ آؤر کی چلتی ہوئی انگلیاں رکی تھیں۔ وہ اب سراٹھا کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا ہوا اتنے غصے میں کیوں ہو؟“ اعجاز صاحب کو بیوی کا غصہ ہوتا کچھ میں نہیں آیا تھا۔

”جانے کن لوگوں کو بلا کر بٹھا لیا تھا۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی بے عزت کروا کر رکھ دیا اور شکیلہ بوا کو تو میں بعد میں پوچھوں گی۔ کن اٹھائی گیسوں کو اٹھا کر لے آئی۔ اور پھر آنے سے پہلے مصفا کی ماں کی ساری اسٹوری بھی انہیں سنا دی۔ غصہ خدا ایک بچے کا باپ جسے بیوی چھوڑ کر بیٹا اپنے ساتھ لے کر چلی گئی۔ ایسا رشتہ اٹھا کر گھر چلی آئی تھیں۔ لوگوں کی زبانوں کو پکڑا جاتا ہے بھلا۔“ صوفیہ بیگم کی بڑبڑاہٹ عروج پہ تھی۔

”آپ نے ان کا منہ کیوں نہیں توڑا۔“ آؤر نے لیپ ٹاپ گود سے ہٹاتے ہوئے قدرے ناراضی سے کہا۔

”ارے بس کرو۔ ہے تو سچائی نا اور سچ بولنے سے لوگ کیوں ڈریں گے۔ جب سرعام جھوٹ بولا جاتا ہے۔ میں آپ کو صاف بتا رہی ہوں۔ اعجاز مجھے مصفا کے رشتے سے دور رکھیں۔ سوچ بھی نہیں سکتے جب اس عورت نے باتیں کیں تو، میری اور عالیہ کی کیا حالت تھی۔“ صوفیہ بیگم نے سختی سے کہا۔ اور اٹھ

کراپے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ ”تم نے اماں کو سلی۔“ اعجاز احمد کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے کمرے کا دروازہ بھی بند ہو گیا تھا۔

”اماں کو امی کے لفظوں سے زیادہ آپ کے لفظوں، آپ کی سلی کی ضرورت ہے بابا۔“

آؤر نے افسردگی سے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو اعجاز احمد اس کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ کچھ دیر آؤر نے انتظار کیا تھا۔ کہ شاید اعجاز احمد اٹھ کر اماں کے پاس جائیں لیکن ہمیشہ کی طرح اس کا انتظار، انتظار ہی رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ خود اٹھ کر دادی کے گھر آ گیا تھا۔ اماں لاؤنچ میں ہی بیٹھے ہوئے تھیں۔ جب وہ ان کے قدموں میں آ کر بیٹھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر لیوں سے لگا چکا تھا۔

ایک سکاری ان کے بوڑھے لیوں سے برآمد ہوئی تھی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے وہ روڑی میں ضبط کرتے کرتے ہر بندھن ٹوٹ کے رہ گیا تھا۔ حوصلہ کرتے کرتے ہر حوصلہ ٹھہر سا گیا تھا۔ ان کے پاس شاید شکوے کے لفظ بھی نہیں بنے تھے۔ وہ بس روٹی رہیں۔ اور آؤر نے انہیں رونے بھی دیا تھا۔ دل کی بے بسی، اذیت اور درد آنسوؤں کی صورت بہہ نکلے تھے۔ اتنی دیر رو لینے کے بعد وہ اب بس سونا چاہتی تھیں۔ اس لیے چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

آؤر انہیں سلی دینا چاہتا تھا۔ وہ انہیں کہنا چاہتا تھا۔ کہ فکر نہ کریں جلد ہی مصفا کے لیے اچھا سارشتہ مل جائے گا۔ اور وہ بہت دھوم دھام سے اس کی شادی کریں گے۔ لیکن آج شاید تو کہنے کا موقع تھا۔ اور نہ ہی سنانے کا حوصلہ۔ اماں کے جانے کے بعد تمینہ بی بھی ان کے عقب میں ان کے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ اور آؤر وہی سر جھکا کر بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔

انہوں کا ساتھ ہونا غم کو ہلکا کر دیتا ہے۔ اور ہر

مشکل وقت کو آسان بنا دیتا ہے۔ اور اگر یہی اپنے یوں انجان بن جائیں۔ جیسے ساتھ والے گھر میں موجود کمین انجان بنے بیٹھے تھے۔ یا پھر اسی گلی کے آخر میں بنا اماں کے دوسرے بیٹے کا گھر۔ رشتے تو تھے براحساس کہیں نہیں تھا۔ اپنے تھے لیکن ساتھ کہیں نہیں تھا۔ آذر تھی ہی دیر سر جھکائے وہیں صوفے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ اجا تک ہی مصفا اپنے کمرے سے نکلی اور قالین پہ بیٹھے آذر کو دیکھ کر ایک تجر ساس کی کالی آنکھوں میں ابھرا تھا۔ اسے شاید آذر کا یہاں ہونے کی امید نہیں تھی۔

آذر نے سر اٹھا کر خود سے کچھ قاصلے کھڑی مصفا کو دیکھا جس کی آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سوچی ہوئی تھیں اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ آذر کچھ کہتا وہاں سے بچن میں چلی آئی تھی۔ عین اس سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں کانٹے حلق میں آگ آئے ہوں۔ اس نے دو گھاس پانی اپنے حلق سے نیچے اتارا اور گھاس شیفٹ پر رکھ کر اسٹوولی طرف دیکھا۔ آج اس نے بڑے شوق سے اپنے لئے جلفر بڑی بنائی تھی۔ اور اس وقت کڑھائی میں موجود جلفر بڑی ویسے کے ویسے ہی بڑی تھی۔ آنکھوں میں آنسو پھر سے جمع ہونے لگے تھے۔

اس کی قسمت میں خوش ہونا نہیں لکھا تھا۔ وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ یا شاید اسے خوش ہونے کا کوئی بھی حق حاصل نہیں تھا۔ جس دن وہ خوش ہوئی اس کے ساتھ ایسے ہی ہوتا تھا۔ بھی سبق، بھی حرا، بھی تانی تو بھی جچی کوئی تا کوئی بات کر کے اس کے لبوں سے خوشی کو چھین لیا کرتی تھیں۔ ٹالوں پہ پھسلے آنسوؤں کو اس کے بائیں ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور پیسے ہی چٹی دروازے میں کھڑے آذر کو دیکھ کر اس کا چہرہ غصے سے لال ہوا تھا۔

”مجھے آپ کے کسی بھی لفظ یا سلی کی ضرورت نہیں ہے۔ اماں اپنے کمرے میں ہیں۔ اور اگر وہ

آپ سے ملنا نہیں چاہتیں، تو آپ.....“ ابھی مصفا اپنی بات بھی مکمل نہیں کر پائی تھی۔ کہ آذر دروازے سے ہٹ کر اس کے عین سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

”تم بہت ابھی ہو مصفا۔“ اس نے دل سے کہا تھا۔ لیکن مصفا کے لبوں پہ استہزاء ایسی ابھری تھی۔

”ہاں میں جانتی ہوں۔ میں ایک ابھی ماں کی ابھی بیٹی ہوں۔ بار بار مجھے یاد کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ آخر میں غصے ہوئی تھی۔

”مصفا۔“ آذر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھنا چاہا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ دھکی سے جھٹک دیا تھا۔

”بس کر دیں، خدا کے لیے بس کر دیں۔ آپ کیوں میرے سامنے خود کو فرشتہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، پورا خاندان مجھے اچھوت سمجھتا ہے۔ گندا سمجھتا ہے، ناپاک سمجھتا ہے، بدکردار سمجھتا ہے تو آپ کیوں ان سب کے سچ مہمان بننے ہیں۔“ آنسو چکوں پہ آنسو ٹھہرے تھے۔

آذر تو اس کے منہ سے نکلنے والے لفظوں پہ ہی حیران اور ساکت رہ گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے سر جھٹک کر خود کو ٹائل کیا۔ اپنے غصے کو مصفا پر نشان ہے کہہ کر مکمل کیا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے مصفا، تم فضول مت سوچو۔“ اس نے عار سے اسے سمجھایا۔

”ایسا ہی ہے۔ بالکل ایسا ہی ہے۔“ تانیا تانی، آپ کی باتیں کیا وہ میرا مذاق نہیں بناتے۔ عالی۔“ ابھی اور ان کے بیٹے مجھے سخرانہ نظروں سے نہیں دیکھتے۔ اور آپ کہہ رہے ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ اب شدت سے رو رہی تھی۔

آذر کا دل اس کے یوں رونے پہ بے چین ہوا تھا۔ ”مصفا۔“ اس نے بے تابی سے اس کے چہرے پہ ٹھہرے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں کی پوروں سے صاف کرنا چاہا تھا۔ اس کی یہ حرکت مصفا کو مزید شرمسار کر دلائی تھی۔

اس نے اس کے چوڑے سینے پہ ہاتھ رکھ کر اسے پوری شدت سے دھکا دیا تھا۔ آذر اس کے اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے لڑکھڑاسا گیا تھا۔

”میں بدکردار اور بھائی ہوئی ماں کی بیٹی ضرور ہوں۔ لیکن خود بدکردار نہیں ہوں۔ شادی کے لیے میں اس پورے خاندان میں کسی کے لائق نہیں ہوں۔ تو پھر آپ کی بھردری کے لائق کیسے ہوں۔ اپنی اس بھردری کو آپ اپنے پاس رکھیں۔ مجھے بھردری نہیں سہارا چاہیے تھا مضبوط سہارا۔ لیکن آپ مجھے سب کے سچ سہارا نہیں دے سکے تو یہاں اب وقت بھردری کی آڑ میں مجھ سے قاعدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔“

”بس۔“

مصفا کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ خاموشی سے کھڑا آذر پوری شدت سے دھاڑا تھا۔ اسے یوں جھکیا بارا تھے جسے میں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو مصفا کا دل سکڑا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے حقیقت کی کرب ناک اس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی۔ تو جانے کیوں وہ بے خونی سے آذر کی آنکھوں میں دیکھنے لگی تھی۔ غصے سے آذر نے لب بچھینے ہوئے تھے۔ دانتوں پہ دانت جھے ہوئے تھے۔ کشنیوں کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ اور آنکھیں یوں شعلہ بار تھیں۔ جیسے سب کچھ جلا کر خاکستر کر ڈالے گی۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنے لبوں کو کھولا۔ میز پر ٹھوک مار کر سامنے سے آتیں، اماں کو ایک طرف ہٹانا ہوا گھر سے ہی نکل آیا تھا۔ گھر آنے کے بجائے وہ یوں ہی پیدل چلتا دور تک نکل آیا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا۔ مصفا اس کے بارے میں اتنا گر کر سوچے گی۔ وہ تو بس اسے تسلی دینے کے لیے گیا تھا۔ اسے کہنے کے لیے گیا تھا۔ اسے لوگوں کی بلکہ کسی کی بھی پروا کر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس کا، اماں کا غرور ہے۔ وہ جانتے ہیں مصفا جیسا کوئی اور نہیں ہے۔ اور۔ مصفا جیسا واقعی کوئی اور نہیں تھا۔ جس نے اس رات خود ہی اپنے ہاتھوں

سے اماں کے بعد سب سے مخلص شخص کو کھودا تھا۔ اس رات آذر نے ساری رات سگریٹ پھونکتے اور بے مقصد سرنگوں پہ چلے ہوئے گزاری تھی تو وہیں دوسری طرف اماں نے ایک ناراضی بھری نظر مصفا پہ ڈالی اور واپس پلٹ گئی تھیں اس رات زندگی میں پہلی بار تھا۔ جب اماں نے اسے کمرے میں نہیں بلایا تھا۔ اور وہ وہی جگہ کے ٹھنڈے فرش پہ دونوں ٹانگوں کو سینے سے لگائے گھٹنوں میں سر دیے روئی رہی تھی۔

آخر وہ بھی زندہ کیوں گی۔ کیوں اس کی ماں نے اس کے باپ کی طرح اسے بھی مار کیوں نہیں دیا۔ بلکہ اس نے اسے پیدا ہی کیوں کیا تھا۔ وہ روتے ہوئے مسلسل ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔ لیکن ساری رات سوچ کے نظروں کی مانند چلتی شب بھی اسے اس کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکی تھی۔

آہ اس کی بد قسمتی اس جیسا بد قسمت اس کا نجات میں کوئی نہیں تھا۔ وہ بھی اپنی بد قسمتی پہ روئی رہی۔ تو کبھی اپنے وجود سے..... یعنی رونا اس کا مقدر ٹھہر گیا تھا۔ تاحیات، تازہ زندگی۔

☆ ☆ ☆

اماں پورے دھوم دھام سے اسے اپنے باور کی دہن بنا کر اسے گھر لائی تھیں۔ ہمیشہ کا سعادت مند یاد و اماں کی خوشی میں خوش تھا۔ اور پھر زندگی خوشیوں کے پینڈیوں میں جموتی حرا سے گزر رہی تھی۔ یاد و کو اپنی نئی نویلی دہن سے کوئی شکوہ نہیں تھا اور نہ ہی شکایت۔ سوائے اس کے کہ کھانسی بہت کم ہوتی تھی۔ بہت ضروری باتوں کے جواب میں بھی وہ ہوں، ہاں سے کام چلا لیا کرتی تھی۔

اور یہ بات جب کسی کے سامنے اس نے اماں سے کہی تھی۔ تو جہاں عظمیٰ کے چہرے کا رنگ خیر ہوا تھا۔ وہیں ہمیشہ کی طرح اماں نے سکرا ہٹ بھرے چہرے کے ساتھ بیٹے کے شکوے کو سنا تھا۔

”اچھا ہے تا میری بیٹی کو فالتو بولنے کی عادت

نہیں۔ نہ بڑی جیٹانی صوفیہ کی طرح اور نہ ہی چھوٹی دیورانی کی طرح۔

اماں نے مزاح کے انداز میں جواب دیا تھا تو چہاں یاور کے لیوں سے مسکراہٹ نے چھب دکھائی تھی۔ وہیں عظمیٰ کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی صورت کرنے لگے تھے۔ اب کے یاور تو یاور خود اماں بھی ششدر رہ گئیں۔ بات تو بلی چٹکی تھی لیکن عظمیٰ کے آنسوؤں نے بلی چٹکی کی بات کو اچھا خاصا بھاری بنا دیا تھا۔

”بس تو بس ایسے ہی کہہ رہا تھا۔“ اماں کی خشمگین نظروں سے گھبرا کر یاور نے فوراً ہی اپنی نئی ٹوپی دہن کو بھلایا تھا۔ اور پھر معذرت کرنے اور آئندہ شکایت نہ کرنے پر یاور احمد کی جان خلاصی ہوئی تھی۔

ماور گورنمنٹ جاب کرتے تھے اسی لیے آج کل ان کی پوسٹنگ دوسرے شہر میں تھی۔ شادی کے بعد ہنگامے سرد پڑے۔ خاندان کی دھنوں کا اختتام ہوا۔ اور تو اور عظمیٰ اور یاور ایک بچے کے لیے شمالی علاقہ جات بھی ہو آئے تھے۔ زندگی عام روٹین پہ آچکی تھی۔ تو تب ہی یاور نے عظمیٰ کو سامان پیک کرنے کا کہا۔

”کیوں۔“ ایک حرفی لفظ عظمیٰ کے لیوں سے نکلا تھا۔

”ارے بھئی، مزدور بندہ ہوں، سرکار کا۔ اب کیا ایسے ہی بیٹھا رہوں گا۔ نوکری یہ جاتا ہے۔ تو چیکنگ کرلو۔“ ریموٹ سے ٹی وی آن کرتے ہوئے یاور نے گردن موڑ کر اپنے دائیں طرف بیٹھی خوب صورت بیوی کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اپنے ہاتھوں کو مروٹی وہ اثبات میں سر ہلا کر کھڑی ہوئی۔

”شروع شروع میں اکیلا پن تو محسوس ہوگا۔ لیکن پھر عادت ہو جائے گی۔ تم بھی میری بھوکا خیال رکھنا۔ یہ نہ ہو جاتے ہی سرکاری نوکری میں اتنے کم ہو جاؤ کہ پیچھے گھر میں بیوی کو بھول جاؤ۔“ اماں بیٹھے

کے لیے باوام کاٹتے ہوئے یاور سے کہہ رہی تھیں۔ جب کمرے کی طرف جاتے تھے عظمیٰ حیرت سے پلٹی اور ”جی اماں جو حکم آپ کا۔“ کہہ کر اماں کے گھٹنوں کو دباتے یاور کی طرف حیرت سے ڈیڑھ لگی۔ شاید یہ اس کی نظروں کا اثر تھا۔ اماں سے بات کرتا یاور، عظمیٰ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”کیا ہوا؟“ یاور نے ہونے سے ابرو اٹکاتے ہوئے اپنے لیوں کو چٹکی عظمیٰ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جواب اپنی جگہ سے پلٹ کر اماں کے پاس خالی جگہ پر آ بیٹھی تھی۔

”اماں! مجھے کہیں نہیں جانا۔ یہی رہا ہے۔ آپ کے پاس۔“ عظمیٰ نے کہتے ہوئے ٹھیل کے پاس گھرے پانچ سال کے آؤر کو اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ جہاں اماں اور یاور، عظمیٰ کی بات پر حیران ہوئے تھے۔ وہی جگہ سے نکلتے صوفیہ بھائی بھی لچھے بھر کر کمرے کی کویوں دیکھنے لگیں کہ جیسے اس کے سر پر سیٹنگ آگ آئے ہوں۔

”اماں! میں خود خالی گھر سے اس بھرے پورے گھر میں آئی ہوں جہاں سب ہیں، بچوں کی شرارتیں ہیں۔ میں نے ہمیشہ ان چڑوں کو مس کیا ہے۔ اب جب مجھے موقع مل رہا ہے۔ تو میں ان لمحوں کو گھونٹا نہیں چاہتی۔ مجھے یہی رہتا ہے آپ سب کے ساتھ۔“ کہنے کے بعد عظمیٰ نے کیا جت بھری نظروں سے اماں کی طرف دیکھا۔

اماں بے چاری کیا کہیں۔ کہنے کو تھا تو بہت کچھ جیسے اگر اتنی ہی تنہائی اور اکیلے پن سے خائف ہو تو پھر کیوں سارا سارا دن اکیلا کمرے میں بند پڑی رہتی ہو۔ مارے باندھے صبح کے برتن دھوئے گئے بعد وہ مشکل سے ہی دوپہر میں اپنے کمرے سے باہر نکلتی تھی۔ نئی نئی دہن تھی، اماں بھی کچھ نہیں کہتی تھیں۔ حالانکہ صوفیہ اور عالیہ دونوں ہی اس بات کو نکتی بار دہرایا بھی تھا۔ لیکن اماں نے انہیں بھی خاموش کروا دیا تھا۔ یہ کہہ کر کہہ کر نئے گھر اور نئے لوگوں کے ساتھ ایذا جٹ ہونے میں وقت لگتا ہے۔

”اب یہ تو تمہارا اور یاور کا معاملہ ہے۔ میری طرف سے تو کوئی پابندی نہیں ہے۔ نہ یہاں رہنے اور نہ ہی یاور کے ساتھ جانے۔“ اماں نے کئے ہوئے باداموں کی کٹوری صوفیہ بیگم کی سمت بڑھائی اور بال خاموش بیٹھے یاور کے کورٹ میں ڈال دی۔

”ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔“ یاور نے ٹنگو کو سمیٹا اور صوفیہ بھائی سے کھانے کے بارے میں پوچھنے لگا تھا۔

”بس دن، پندرہ منٹ لگیں گے۔ عالیہ روٹیاں بنا رہی ہے۔ میں ٹھیل پہ کھانا لگانے لگی ہوں۔“ صوفیہ بھائی نے مسکرا کر کہا۔ اور ایک عجیب سی نظر اپنے لب چٹکی عظمیٰ کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

یاور کے لاکھ کہنے پہ بھی عظمیٰ ان کے ہمراہ جانے پر راضی نہیں تھی اور جب یاور نے ذرا سختی سے بات کی۔ تو وہ حسب عادت رونے میں مصروف ہو چکی تھیں۔ یاور سخت خجھلایا تھا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا عظمیٰ، جو تم اس طرح رونے لگی ہو۔“ غصے کو ضبط کرتے ہوئے یاور نے حتی المقدور اپنے لچھے کو مائل رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”بس مجھے نہیں جانا۔“ اپنی سرخ ناک کو ٹشو سے صاف کرتے عظمیٰ نے ضدی لچھے میں کہا تو یاور جا کر واپس آنے کے بعد انہیں سمجھانے کا ارادہ لیے اپنی جاب پہ لوٹ گیا تھا۔

اور پھر تھہ ماہ کے بعد جب وہ واپسی طور پر خود کو راضی کر چکا تھا کہ عظمیٰ وہیں اماں کے پاس رہے گی۔ عظمیٰ نے گھر آئے یاور کے ساتھ چلنے کی فرمائش کر

ڈالی تھی۔ اس کی بات پہ یاور کو غصہ تو بہت آیا تھا۔ اور اس بار اس نے اپنے غصے کو چھپانے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”اب تم نہیں رہو، اماں کے ساتھ۔ اچھا ہے اماں کو تمہارے ساتھ دوسرا ہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ ورنہ تو صوفیہ بھائی کے الگ ہونے پہ اماں خاصی اداس رہی تھیں۔ اور یوں بھی میرا ایک دوست اپنی فیملی کو لانا چاہتا ہے۔ میں اسے اپنا لانا کیا ہوا گھر رہنے کے لیے دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تب تک جب تک اسے اپنا کوارٹر نہیں مل جاتا۔“ یاور نے کہتے ہوئے اپنے سامنے پڑے کپ کا اٹھا کر لیوں کو لگایا ہی تھا۔ جب اس کے کانوں میں عظمیٰ کے رونے کی آواز پڑی۔

”عظمیٰ۔“ یاور کے لچھے میں درشتی ابھرائی تھی۔

لیکن پھر عظمیٰ کے رونے من مٹانے اور چڑوں کو اٹھا کر جتنے کا سلسلہ جو شروع ہوا۔ تو اماں نے یاور سے کہہ دیا وہ عظمیٰ کو اپنے ساتھ لے جائے۔

”جیسے لے جاؤں اماں، وہ بھی اس حالت میں جب اسے ہر وقت کسی کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ اور یوں بھی جب ہماری مرضی کے مطابق نہیں چلتا۔ جب میں چاہ رہا تھا کہ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ تب وہ یہاں رہنے پہ رضامندی۔ اور اب میں کہہ رہا ہوں نہیں رہو۔ تو وہ ساتھ چلنے پہ معز ہے۔ سوری، میں کاٹھ کا الو تو ہوں نہیں جو اس کے اشاروں پہ چلتا رہوں۔“ یاور نے صاف ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

”اس نے مجھ سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ یاور ایسی حالت میں یہ لاپرواہیاں اس کے اور بچے کے لیے ٹھیک نہیں۔ تم اسے آرام سے سمجھاؤ کہ وہ ڈیوری ہونے کے بعد لے جاؤں گا۔ مان جائے گی تمہاری بات۔“

اماں نے یاور کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے محنت بھرے انداز میں کہا تو یاور نے ایک شکوہ بھری

نگاہ ماں پر ڈالی۔ اور پھر عظمیٰ کو لاکھ سمجھانے پہ بھی وہ اسے اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹا سکتے۔ اور مجبوراً اسے ایک بار پھر اماں کے کہنے پہ اس کی بات ماننا پڑی تھی۔ اور یوں وہ عظمیٰ کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

☆☆☆

اچھے ہونے کی بھی کبھی بہت بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔ اور کبھی کچھ یاور کے ساتھ ہوا تھا۔ مصفا ابھی فقط دو ماہ کی تھی۔ جب ایک دن یاور نے اپنے گھر سے کسی امتحان آدی کو نکلے دیکھا۔ اس دن اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے وہ جلدی گھر لوٹ آیا تھا۔ ابھی وہ گھر سے کچھ دور ہی تھا۔ جب اس نے تیزی سے اپنے گھر سے اس شخص کو نکلے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ یاور اسے پہچانتا۔ وہ آدی گلی میں موجود ذیلی گلی میں مڑ کر جانے کہاں گیا تھا۔ یاور نے اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن وہ ناکام ٹھہرا۔ اور غصے سے گھر پلٹ آیا۔ اس کے پاس آٹو چیک ڈور کی چابی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلا آگیا۔ یاور کو بتانا مگر آتے دیکھ کر عظمیٰ بے اختیار شیشائی مچی۔

اس سے پہلے کہ وہ عظمیٰ یاور نے اس کا بازو دبوچ لیا تھا۔

”کون تھا وہ شخص؟“ یاور کی آنکھوں اور لہجے سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

”کون شخص؟“ عظمیٰ ہٹکاتی تھی۔

اگلے ہی لمحے یاور کا ہاتھ اٹھا تھا۔ اور اس کے چہرے پہ نشان چھوڑ گیا تھا۔ عظمیٰ اس ٹھٹھک کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ لڑکھرائی اور زمین پہ جا کر گری۔ اس سے پہلے یاور مزید کوئی سوال۔ عظمیٰ تیزی سے اٹھی اور ان کے سامنے بے خوفی سے کھڑی ہوئی تھی۔

”اچھا ہوا تمہیں فراز کے بارے میں پتا چل گیا۔ میں بھی اس مٹی چوہے کے ٹھیل سے ٹک آگئی ہوں۔“

گرا نے کے لیے کافی تھا۔ اسے عظمیٰ سے لکھن توڑ نہیں تھی۔

وہ جہاں حیرت کی زیادتی سے گنگ ہوا تھا۔ وہیں عظمیٰ اب فراز کے بارے میں بتا رہی تھی۔ فراز کے بارے میں جس سے وہ شادی سے پہلے محبت کرتی تھی۔ اور شادی کے بعد بھی اسی سے محبت کی دعوے دار تھی۔

”غریب اور یتیم ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا۔ میری ماں، تمہاری ماں کے اچھے اخلاق، دولت اور تمہاری سرکاری نوکری کے جھانسنے میں آجانی۔ میں نے اپنی ماں سے کہہ دیا تھا۔ مجھے فراز سے محبت ہے۔ اور مجھے اسی سے شادی کرنی ہے۔ لیکن ہر ماں کی طرح میری ماں کو میری محبت وکی جذباتیت کے سوا کچھ نہیں ملتی تھی۔ اسے لگتا تھا۔ محاشرے میں رہنے کے لیے پیسہ اور نوکری ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ یہ محبت اور محبت جیسی خرافات کا ہم جیسوں کے ساتھ کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بھول گئی تھی۔ ہم جیسے بھی دل کے سامنے مجبور ہوتے ہیں۔ میں بھی مجبور ہوں یاور۔ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔“ وہ اپنے شوہر کی تحیر زدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی۔

”یہ بھی نہیں ہوگا عظمیٰ۔ اپنے دل کو سمجھاؤ۔ یہ زندگی ہے کوئی ظلم یا ذرا مہ نہیں۔ تم اب ایک عورت نہیں، ایک بچی کی ماں بھی ہو۔ تمہارا ایک غلط قدم ساری زندگی میری محسوس بچی کی زندگی پہ اثر انداز ہوگا۔ میں تمہیں صرف اور صرف مصفا کی وجہ سے.....“

ابھی یاور کے بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ عظمیٰ بول پڑی تھی۔ ”میں نے جو کہتا تھا دیا ہے۔ تم مجھے عزت سے نہیں جانے دو گے تو میں بھاگ جاؤں گی۔“

”اور میں تمہیں جانے دوں گا۔“ یاور غصے سے باہر ہوتا ہوا۔ عظمیٰ پہ پل پڑا تھا۔ وہ اسے مارتا رہا۔ اور وہ اس کے ہاتھوں میں رہی تھی۔ اور ایک ہی بات

دہرائے جا رہی تھی۔ ”میں چلی جاؤں گی۔ تم کچھ بھی کر لو جتنا بھی مارو۔ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔ یہاں تک کہ یاور اسے مار مار کر ٹھک گیا تھا۔ لیکن وہ مار کھاتے تھا۔ نہیں ٹھک رہی تھی۔ عظمیٰ نیلیوں نعل جسم کے ساتھ اور پھر اکی جیج عظمیٰ چلی گئی تھی۔ زندگی کا یہ رخ یاور یاور کی عزت کو روک کر چلی گئی تھی۔ اماں اور دونوں بھائی حیرت کو پا کر سارے گھر میں ہلچل مچا دی تھی۔

”میرے چلو ہم تھانے جا کر رپورٹ درج کر داتے ہیں۔“ کمال نے بھائی کا بازو ہتھک کر کہا تھا۔ یاور نے جھٹکے سے اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا بازو پھیر دیا اور اماں کی طرف دیکھا۔ ”یہ آپ نے میرے ساتھ کیا کر دیا ہے اماں۔ دونوں بھائیوں کی طرح میرا بھی حق تھا۔ اچھی زندگی جینے کا تو پھر کیوں میری بار آپ اپنی غریب دوست سے دھوکا کھا گئی ہیں۔ کیوں آپ اپنی دوست کی بیٹی کو بچان نہیں پاتی ہیں۔“

یہ بھائی نے ان سے کتنا کہا تھا۔ عظمیٰ کے بجائے اس کی ماموں زاد کا رشتہ دیکھ لیں۔ لیکن جب انہیں گاؤں میں مقیم اپنی بچپن کی دوست کا خیال تھا۔ جس کی انکو بیٹی کو وہ بہو نہیں بلکہ بیٹی بنا کر لائی تھیں۔ اور اس نے کیا کیا؟ اماں تو منہ پر وہ ہنار کھ کر رو پڑی تھیں۔ تو وہیں یاور دروازے کو کھوکھ مارتا ہوا کمرے سے بی بی نہیں گھر سے بھی نکل گیا تھا۔

اور پھر کون جانتا تھا۔ غصے میں ٹپٹے یاور کو موت تلے لگانے کے لیے بے تاب تھی۔ بتا منزل کا تعین کیے وہ یونہی چلتا جا رہا تھا۔ جب اچانک ہی راہ میں کھڑے چند راہ گیر آپس میں لڑ پڑے تھے۔ ان میں سے ایک فریق کے پاس پستول تھی۔ اس نے اندھا دھند گولیاں چلا دیں اور انہی میں سے ایک گولی یاور کے سر میں لگی تھی۔ یاور تو موقع پر دم توڑ گیا۔

تھا اور باقی تین لوگوں کو ہسپتال لے جایا گیا۔ جہاں انہیں طبی امداد دی گئی اور مقدمہ درج کروایا گیا۔ یہ وقت اماں کے لیے بڑا تکلیف تھا۔ جوان بیٹا منٹوں میں دنیا سے منہ موڑ گیا تھا وہ بھی عظمیٰ کے دیے زخم کا داغ لے لے کمال اور انکاڑ کے لیے بھی یہ وقت کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ قیامت آ کر گزرتی تھی لیکن اپنے پیچھے اپنے اثرات چھوڑ گئی تھی۔ رفعت چاکڑوں سے آئی تھیں۔ اور رو رو کر اماں سے معافی مانگتی رہیں۔

”تمہاری بیٹی راضی نہیں تھی۔ تو رفعت تمہیں نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میرا بچہ یوں بھری جوانی میں اس دنیا سے نہ جاتا۔“ اماں سبک پڑی تھیں۔

”وہ میرے پاس نہیں آئی خدیجہ، اور نہ ہی اس نے مجھ سے رابطہ کیا۔ میرا تم سے وعدہ ہے۔ وہ جب بھی میرے سامنے آئے گی میں خود اپنے ہاتھوں سے اس کی جان لے لوں گی۔“

لیکن رفعت بی کا انتظار انتظار ہی رہا۔ عظمیٰ پلٹ کر نہیں آئی تھی۔ یہاں تک کہ رفعت بی اس دنیا سے چند ماہ کے بعد موز گئی تھیں۔

تم ایک طرف تھا۔ تو دوسری طرف مصفا جس کی کوئی بھی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سب اس سے یوں بھاگتے جیسے وہ اچھوت ہو۔ اتنی ہیزاریت دیکھ کر اماں نے خود ہی کمال کو بھی الگ رہنے کی اجازت دے دی تھی اور خود مصفا کے ساتھ اسی گھر میں رہنے لگی تھیں۔

وقت کب رکتا ہے۔ کب ٹھہرتا ہے۔ کچھوے کی چال سے بھی چلے تو دن، مہینوں میں اور مہینے سالوں پر محیط ہو گئے تھے۔ اماں کا یہ اول تھا۔ مصفا کی شادی آؤر سے ہو جائے تو وہ پوتے اور پوتی کے ہمراہ اپنی باقی ماندہ زندگی گزار لیں۔ لیکن ہمیشہ کی طرح ایسا ہونے کے بجائے مصفا امتحان کی صورت ان کے نازک کندھوں کا بار بنی رہ گئی تھی۔ اور ہمیشہ کی طرح حوصلہ مند اماں آج حوصلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔

مصفا کی ماں کا ماضی اس کے مستقبل کو نکلنے کے لیے تیار تھا۔ اماں کے پاس دعاؤں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ نماز تہجد کے بعد اماں نے اپنے کانپتے ہاتھوں کو اٹھایا تو ایک بار پھر پوری شدت سے رو پڑی تھیں۔

☆☆☆

دن ویسے ہی تھے۔ رات بھی اپنے وقت پہ آجاتی تھی۔ آج بھی موسم معمول سے ہٹ کر زیادہ سرد ہو رہا تھا۔ اور وہ موسم کی شدت سے بے نیاز برآمدے کے بلرے سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہاتھوں کی ٹھکالی تھیلی میں موجود لکیروں کو دیکھتے ہوئے جانے کیا سوچے جا رہی تھی۔ اس کی براؤن چادر اس کے کندھوں سے پھسل اس کے قریب فرش پہ پڑی تھی۔ بالوں کی چند ٹیس کچر کی قید سے آزاد ہو کر ہوا کے سنگ بھی اس کے چہرے پہ جمولے لگتیں تو بھی عجب میں اڑنے لگتیں۔

پہلے اگر وہ اس طرح بیٹھی ہوتی۔ اماں اسے بے تھک سنا کر کرب کی اندر بلا بھی ہوتیں۔ لیکن اب تو لیاں بھی جیسے اس کے وجود سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔ وہ خود سے اماں کو بلا لیتی اماں جواب دے دیتیں۔ ورنہ سارا دن خاموشی کی بیل اوڑھے یا تو تسبیحات پڑھتی رہتیں یا پھر نوافل کی ادائی میں مصروف رہتیں۔ جانے وہ کیوں لے لے بے جلدے کرتے ہوئے ہاتھ اٹھائیں تو نیچے کرنا ہی بھول جاتیں۔ حالانکہ مصفا نے ایک دو بار ان سے کہا تھا۔ ”دعاؤں سے کچھ نہیں ہونے والا تھا۔ یہ لے لے بے جلدے کیا اس کی حقیقت بدل دیں گے۔ یہ دعا کے لیے اٹھے ہاتھ اس کا حوالہ بدل دیں گے۔ اس کی ماں کا حوالہ۔“ نہیں، کچھ بھی بدلنے والا نہیں تھا۔ پھر بھی اماں۔

کھلنے کی آواز پہ وہ اپنے خیالوں سے جھکی تھی اور گیت سے اندر آتے آؤ کو بے خیالی میں دیکھنے لگی تھی۔ جو اسے یوں اتنی سردی میں بیٹھا دیکھ کر وہیں رک گیا تھا۔ وہ اس دن کے بعد آج آیا تھا۔ وہ

مصفا سے سخت ناراض تھا۔ جس نے اس کی اس دن کی پروا کو ہمدردی کے لبادے میں اوڑھے قاتلہ اٹھانے سے جوڑ دیا تھا۔ یہ بات آؤ کے دل کو چیر کر رکھ گئی تھی۔ اس لیے اس نے اپنی نظروں کو مصفا کے وجود سے ہٹایا اور اس کے پاس سے گزر کر اندر چلا گیا تھا۔ اسے اماں نے فون کر کے کے بلایا تھا۔ اگر اماں فون نہ کرتیں۔ وہ ابھی بھی اس گھر میں نہیں آتا چاہتا تھا۔

کتنی دیر گزرتی تھی۔ آؤ کو آئے اور اماں نے اسے ابھی تک آواز دے کر چائے کا نہیں کہا تھا۔ وہ مزید کچھ دیر وہیں بیٹھی رہی۔ اور پھر اٹھ کر اماں سے قریبی مارکیٹ تک جانے کی اجازت لینے آئی تھی۔ اسے لگا تھا اگر وہ مزید چند دن اسی طرح گھر میں رہی تو پاگل ہو جائے گی۔ اپنا جتنی توازن کھو دے گی۔ اس نے دستک دینے کے لیے جیسے ہی ہاتھ اٹھایا ادھ کھلے دروازے سے آئی ہے آواز سن کر اس کا ہاتھ وہی ہوا میں مفلج ہوا تھا۔ اماں اس سے مصفا کے لیے آنے والے کسی رشتے کا ذکر کر رہی تھیں۔ رشتے کا سنتے ہی ایک آگ سی اس کے وجود میں لگی تھی۔ اس نے جھٹکے سے دروازے کو کھولا اور کمرے میں داخل ہوئی۔

اس کے یوں دروازہ مار کر اندر داخل ہونے پر ماں اور آؤ دونوں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ”بس کر دیں اماں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ کیوں مجھے ذلیل کر دانا چاہتی ہیں۔ نہیں کرنی مجھے شادی۔“ آپ جائیں یہاں سے۔“ وہ اب آؤ کی جانب رخ موڑے کھڑی رہی تھی۔ میرا اور اماں کا مسئلہ ہے۔ ہم دونوں خود حل کریں گے۔“ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ جیسی ان دنوں ہو رہی تھی۔

”بد تمیزی مت کرو۔“ آؤ خفگی بھرے لہجے میں کہتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”آپ یہاں سے جائیں۔“ وہ چیختی تھی۔

”بس۔“ آؤ نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ کر چھوڑا۔ اس کے لہجے میں اتنی سختی تھی کہ مصفا نے غصے اور خفگی سے اماں کی طرف دیکھا۔ ”یہ ہوتے کون ہیں۔ میری زندگی کے فیصلے کرنے والے۔“ اس نے اماں سے چلا کر سوال کیا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے مصفا۔ پاگل ہو گئی ہو۔ مجھے کسی نہ کسی سے تو مشورہ کرنا ہے۔ اور پھر.....“ ”آؤ، آؤ، آؤ.....“ وہ اماں کی بات کاٹ کر چلائی تھی۔ ”میں خود اپنی زندگی کا فیصلہ کر سکتی ہوں۔“ اس نے اپنی بازو پہ دھرا آؤ کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے غصے کہا۔ ”کیوں ایسے کر رہی ہو مصفا۔ تم کیوں اتنی بدگمان ہو رہی ہو مجھ سے۔“ آؤ کو واقعی اس کا یہ رد عمل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ اب اپنا غصہ بھلائے اس سے آرام سے سوال کر رہا تھا۔ ”میں تو میں آپ سے پوچھتا جا رہی ہوں۔ آپ کیوں اپنے چہرے سے نقاب اوڑھے یہاں چلے آتے ہیں۔“ آنکھوں میں مسخرانہ چمک لیے وہ اس سے سوال کر رہی تھی۔ ”مصفا بس کرو۔“ اماں نے اسے روکنا چاہا۔ ”رک جائیں اماں۔ مجھے بھی جاننے دیں کون سے نقاب اوڑھ کر میں اس کے سامنے آتا ہوں۔“ آؤ نے ہاتھ اٹھا کر اماں کو منع کیا۔

”نفرت سے اماں، مجھے اس انسان سے۔ بس مجھے سے بھائے ہیں نفرت کرتے ہیں، تو کھلم کھلا اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اور یہ..... یہ انسان.....“ مصفا نے ہاتھ اٹھا کر آؤ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اماں! یہ اتنے بھی اچھے نہیں ہیں۔ جتنا آپ سمجھتی ہیں۔ یہاں آکر ہمدردی کے دو بول سنائے والا گھر جا کر میرا اپنی بیوی اور بہنوں کے سامنے مذاق اڑاتا ہے۔ کیا کہا تھا آپ نے حرا سے..... کہ آپ نے مجھے چیک کیا تھا۔ اپنی ماں کی طرح پھنس جاؤں گی آپ کے ساتھ یا نہیں۔ اور

میں نکلی بھی اپنی ماں جیسی ہی۔“ وہ اب رو رہی تھی۔ نری طرح رو رہی تھی۔ ”آپ کے ایک اشارہ کرنے کی دیر بھی اور میں.....“ آؤ تو آؤ اماں بھی اس کی بات پہ حیران رہ گئی تھیں۔

”اپنی بیوی کے سامنے میرا مذاق بناتے ہیں۔ ہاں ہوں میں اپنی ماں جیسی۔ ہوں میں غلطی کی طرح۔“

وہ اب ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ ساکت کھڑے آؤ کے وجود میں حرکت ہوئی تھی۔ اس نے روٹی ہوئی مصفا کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کھینچا ہوا۔ اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا۔ اماں کے اندر ان کی ہمت نہیں تھی۔ وہ ان کے ہمراہ جائیں۔ اسی لیے وہ گرنے کے انداز میں بیڈ کے کنارے بیٹھ کر رو رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں۔ آؤ ایسا کبھی نہیں کر سکا تھا۔ انہیں اپنے پوتے پہ خود سے کہیں زیادہ یقین تھا اور ان کا یقین یوگی نہیں تھا۔

”حرا، فزا، حق۔“ وہ لاؤنچ میں کھڑا ہو کر پوری شدت سے چلایا تھا۔ اپنے اپنے کمروں میں آرام سے بیٹھی ہوئیں حرا، حق اور فزا کے ساتھ ساتھ صوفیہ بیگم اور اعجاز احمد بھی اپنے کمرے سے باہر آ چکے تھے۔ مصفا نے آؤ کی ہاتھ کی گرفت سے اپنا بازو جو چھڑانا چاہا۔ فزا کے چہرے پر بڑی ناگواری اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے چمکی نہیں رہی تھی۔ ”شٹ اپ“ آؤ نے اپنی اٹھا کر مصفا سے کہا۔ اور جھٹکے سے اس کے بازو کو چھوڑا۔

”کیا ہو گیا ہے آؤ۔ اس طرح اسے کیوں لے کر آئے ہو۔“ حیران ہوتے ہوئے صوفیہ آگے بڑھیں۔ آؤ نے آگے بڑھ کر فزا کے چہرے لیے کھڑی حرا کے چہرے پہ پھٹ کر مسکایا تھا۔ حرا اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”آؤ۔“ اعجاز صاحب آگے بڑھے تھے۔ ”اور تم۔“ اب کے آؤ جیل کی تیزی سے فزا کی سمت لپکا تھا۔ فزا آؤ کو صوفیہ بیگم کے پیچھے چھپی۔

”کیا ہو گیا ہے آذر۔ تم اس دو ٹکے کی لڑکی کے لیے اپنی بہن اور بیوی۔۔۔۔۔“ اس سے پہلے کہ صوفیہ بیگم اپنی بات مکمل کرتیں۔ آذر نے ٹپکلی پہ پڑے شیشے کے گلدان کو ہاتھ مار کر زمین پر گرادیا تھا۔ ”دو ٹکے کی یہ نہیں بلکہ دو ٹکے کی تو یہ ہیں جو مجھ سے جھوٹی باتیں منسوب کر کے اس مصوم کو جیسی تار چر کرتی ہیں۔“ آذر غصے سے چلایا تھا۔

”کون سی باتیں۔ کیا ہو گیا ہے، تم اس جھوٹی لڑکی کی وجہ سے۔۔۔۔۔“

”بس کریں امی، بس کریں۔۔۔۔۔“ آذر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر صوفیہ بیگم کو مزید بولنے سے منع کیا۔ ”انٹوس ہو رہا ہے مجھے۔ کہ آپ جیسی جھوٹی سوچ رکھنے والوں کی وجہ سے میں نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا غلط فیصلہ کر لیا۔ بابا، میں چپ نہیں رہوں گا۔ پوچھیں اس سے کیوں اس نے مصفا کو تار چر کیا۔ بچی طور پر اسے ڈسٹرب کیا۔“ آذر نے روئی ہوئی مصفا کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں تو ہمارے سچ بات ہوئی تھی تو یہ کون ہوتی ہے آپ کو ہمارے خلاف بھڑکانے والی۔“ شفیق نے شعلہ باز نظروں سے مصفا کو دیکھا۔

”اوہ! تو تم بھی ان میں شامل ہو۔“ آذر نے اپنے لبوں کو کھینچا۔

مصفا روٹے ہوئے واپس پلٹ آئی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ گھر واپس آئی تو جس طرح اماں کو چھوڑ کر گئی تھی۔ اماں اسی طرح اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اماں کے قریب آئی۔ فرش پہ بیٹھی اور اپنا سر اماں کی آغوش میں رکھ کر اپنے دونوں بازوؤں کو ان کی کمر کے گرد حائل کر دیا تھا۔

”اماں! تربیت مار جانی ہے۔ حوالے جیت جاتے ہیں۔“ آنکھوں کی ریشیں مزید سرخ ہوئی تھیں۔ آنسو کناروں سے ٹھٹھکنے کو بے تاب تھے۔ سرخ ناک مزید سرخ ہو رہی تھی۔ اور گردن کی ریشیں ضبط کے باعث مزید پھولی ہوئی تھیں۔

اماں نے اپنی نظروں کا زادیہ بدلا۔ اور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ایک ششکسی سی لکڑی تھی۔ لیکن کمال ضبط سے اماں نے خود کو روکنے سے روکا تھا۔

”اماں! آپ میری شادی کر دیں۔ اماں میں اب مزید یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ مگر یہ نظریں میرا جگر چٹکتی کر رہی ہیں تو جھوٹی باتیں میرے دل کو زخمی کیا ضرورت تھی ترا کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی۔ پس پردہ وہ میرا مذاق بتا رہی تھی۔ مجھے بتا رہی تھی کہ میں ان کی نظروں میں کیا حیثیت رکھتی ہوں۔“ آذر کے سامنے۔۔۔۔۔“ وہ آپ خود کو روک نہیں پاتی تھی۔ وہ بچکیوں سے رو رہی تھی۔ سسکیوں سے آنسو بہا رہی تھی۔

”اماں! مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔ جو بھی رشتہ آیا ہے۔ آپ ہاں کر دیں۔“ وہ کہہ کر اٹھی اور بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں آکر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہی کیوں خود اماں بھی اپنے کمرے میں رو رہی تھیں۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے چھپ کر ساری رات روئی رہی تھیں۔ یہاں تک کہ آخری ستارے نے ڈوب کر صبح ہونے کی نوید سنائی دی تھی۔ یعنی امید کا ایک دن، ہر طلوع ہوتا دن اس بات کا غماز تھا۔ گہری سیاہ رات کتنی بھی طویل کیوں نہ ہو، اس کا اختتام ہو کر رہتا ہے۔ کیونکہ یہ تو قانون فطرت تھا۔ ہر ایک کا وقت بدلتا ہے۔ تم سے تو خوشی۔ خوشی ہے تو سوگ۔ روشنی اندھیرے کے سامنے بے بس ہوتی ہے تو اندھیرے کے بعد سب روشن ہونے کی امید۔

اور یہ روئی ڈھلتی شب اس کے لیے خوشیوں کے دنوں کو قریب لانے والی تھی۔ اماں کو ابھی بھی اپنی دعاؤں پہ جانے کیوں بہت یقین تھا۔ کمال یقین۔۔۔۔۔

☆☆☆

اماں نے صبح ہوتے ہی اس کے آئے پردہ پزل کو گھر لانے کا فیصلہ کرتے ہوئے انیس فون

کہا تھا۔ مصفا کو کسی بھی بات سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ اس گھر سے جانے والی ہے۔ آذر کو خبر ہوئی۔ تو وہ اماں سے بہت ناراض ہوا۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ زیادتی مت کریں اس کے ساتھ۔“

اس کے مہمانوں کے جانے کے بعد آذر، اماں سے ناراضی سے بولا تھا۔ تو وہیں پہلی بار اعجاز اور کمال صاحب بھی اماں کے اتنی تجلّت بھرے فیصلے پہ کبیدہ خاطر تھے۔

”بے شک برسوں کی جان پہچان ہے۔ لیکن جان پہچان میں اور رشتے واری میں بہت فرق ہوتا ہے اماں۔ ہمیں اچھے سے لڑکے کے بارے میں تحقیقات کروانی چاہیے تھی۔ گھر بار دیکھنا چاہیے تھا۔ میں آپ کے ساتھ چلا۔ سوچتے سمجھتے پھر فیصلہ کرتے۔ لیکن آپ نے تو انہیں اپنی رضا مندی کا عندیہ دیتے ہوئے نہ صرف رشتہ طے کر دیا۔ بلکہ انہیں ٹھٹھکی کرنے کا بھی کہہ کر دیا۔“ آذر غصے سے بول رہا تھا۔ لیکن آج اماں کو اس کی ٹھٹھکی یا ناراضی کی پروا نہیں تھی۔

”تم سب اپنے جاؤ۔ بہت شکریہ اپنے قیمتی وقت میں سے تم لوگوں نے قیمتی لڑکی کے لیے وقت نکالا۔“ اماں کا لہجہ طنز نہیں تھا۔ لیکن لفظ۔۔۔۔۔!

اعجاز اور کمال کے ساتھ ساتھ صوفیہ اور عالیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ یعنی بیٹوں کو قابو کرنے کے لیے اماں نے نیا اور بالکل الگ حربہ نکالا تھا۔ وہ بے چین نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں۔ اور آذر، آذر تو ان کے اس انداز پر بھڑک اٹھا تھا۔

”اماں! آپ کیا کر۔۔۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بولتا۔ اماں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے منع کیا۔

”تم اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ تمہیں صبح آفس بھی جانا ہوگا۔“ اماں نے کہتے ہوئے اپنے دونوں ٹھٹھوں پہ ہاتھوں کو باؤ ڈالا۔

”شمینہ لی! یہ لوگ جائیں تو گیت بند کر لینا۔ میں مصفا کے پاس جا رہی ہوں۔“ وہ سب کو حیران چھوڑ کر اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

”اماں کو تو عادت ہے۔ یو کی۔۔۔۔۔“ صوفیہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ لیکن پھر شوہر اور بیٹے کا موڈ بری طرح آف دیکھ کر انہوں نے چپ رہنے اور یہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔ آتے ہوئے وہ اپنے ساتھ فزا کو بھی لے آئی تھیں۔

☆☆☆

مصفا اماں کے ایک بازو پہ سر رکھے اور اپنا ایک بازو ان کے گرد حائل کے سورہی گئی۔ لیکن اماں کی نظریں میں جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ وہ مصفا کو بھی جی خود سے دور نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا ارادہ مصفا اور آذر کی شادی کے بعد ان دونوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے گھر رکھنے کا تھا۔ لیکن۔۔۔۔۔ ایسا ہو نہیں سکا تھا۔ وہ ہار گئی تھیں۔ صوفیہ کی ہٹ دھرمی اور اعجاز احمد کی خاموشی کے سامنے کمال کی زن مریدی کے سامنے عالیہ کی ”میں“ کے سامنے۔ رشتوں کو جوڑنے کی خواہش بس خواہش رہی تھی۔ مصفا کو خود سے دور کرنا ان کے لیے بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ اور اس کے اس گھر سے چلے جانے میں کتنے گھٹنے بچے تھے۔ فقط چھ گھنٹے۔ مہندی کے سادے جوڑے میں بیٹامیک اپ کے وہ کی مصوم بچے کی مصومیت لیے دل میں اتاری جا رہی تھی۔

اماں کا دل اس کی جدائی کے خیال سے بھر آیا تھا۔ وہ اپنے بازو سے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے ہوئی کمرے سے باہر چلی آئی تھیں۔ ان کی دونوں بیٹیاں مصفا کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تو تھیں۔ لیکن یہاں رہنے کے بجائے فلکشن کے بعد اعجاز کے گھر جا چکی تھیں۔

گہری آہ حسرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اماں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے صوفیہ کی آغوش میں۔ مصفا کے لیے یہی اچھا تھا۔ تو پھر کیوں میرا دل اتنا اداس ہے، بے چین ہے۔“ اماں نے خود

سے سوال کیا تھا۔ اور پھر جانے کیوں رونے لگی تھیں۔

آؤر اپنا فون لاؤنچ میں بھول گیا تھا۔ وہ لینے واپس آیا۔ آٹومٹک لاک کی چابی اعجاز احمد اور کمال احمد کے دونوں گھروں میں بھی تھی۔ تاکہ خدا ناخواستہ کسی بھی ایمر جیسی کی صورت میں کام آ سکے۔ آؤر نے سوچا تھا۔ فون لینے ہی واپس اسی قدموں سے گھر آجائے گا۔ لیکن جب وہ لاؤنچ میں داخل ہوا۔ اماں کو روتا دیکھ کر وہ تیر کی تیزی سے ان کی سمت بڑھا۔ اور ان کے قدموں میں آ بیٹھا۔

”اماں۔“ اس نے اپنا ہاتھ اماں کے گھٹنوں پر رکھا۔ آؤر کو سامنے دیکھ کر جانے وہ کیوں اور بھی شدت سے رو پڑی تھیں۔

”اس کی جدائی کا خیال مجھے غم حال کر رہا ہے۔ وہ چلی جائے گی آؤر۔“ اماں کا یوں رونا آؤر کو تکلف میں مبتلا کر رہا تھا۔

”چلی جائے گی تو کیا ہوا۔ میں تو ہوں نا آپ کے پاس۔ میں نے پایا سے کہہ دیا ہے۔ مصفا کی رخصتی کے بعد میں یہاں اس گھر میں شفٹ ہو جاؤں گا۔ اور فراموشی کی جاتی ہے کہ ہم دونوں آپ کے پاس رہیں۔ تو پھر آپ کیوں؟“

”آؤر کیا تم نے مصفا سے اس لیے شادی نہیں کی تھی کہ وہ عظمیٰ کی بیٹی ہے۔“ کئی دنوں سے سوال پھاس کی صورت اماں کے دل میں گڑا ہوا تھا۔ ایسا کانٹا جو انہیں اذیت میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ وہ جاو کر بھی خود کو اس سوال کے پوچھنے سے روک نہیں سکتی تھیں۔

اماں کو کمرے میں نہ پا کر ان کی تلاش میں کمرے سے باہر آئی مصفا دروازے کے بیچ میں ساکت ہوئی تھی وہ لاشعوری طور پر ذرا سا پیچھے ہوئی تھی۔ تاکہ آؤر یا اماں کی نظر اس پہ نہ پڑ سکے۔ وہ سانس روکنے بنا حرکت کیے آؤر کا جواب

سننا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ وہ کبھی اماں کے ساتھ جھوٹ نہیں بولے گا۔

کیا اس کی ماں کا حوالہ اسے آؤر سے دور لے گیا تھا۔ اس نے بے اختیار دروازے کا سہارا لیا تھا۔ اور اس نے اپنے ہر عضو کو سامتوں میں ڈھلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

اماں کے سوال پہ آؤر کے چہرے پر استہزائیہ ہنسی مسکراہٹ ابھری تھی۔ اور پھر اس نے اپنے لیے معذوم بھی ہو گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ چھکایا۔ اپنی پلکوں کو چھکا اور سر اٹھا کر اپنی جانب دیکھتیں اماں کی طرف دیکھا۔

”وہ یہاں بھی اماں۔“ آؤر نے اپنے ہاتھ کو بائیں جانب دل کے مقام پر رکھا۔ ”یہیں ہے اور یہیں رہے گی۔ وہ میری زندگی میں آئی اس سے بڑھ کر میری خوش قسمتی کیا ہوتی۔ لیکن وہ میری زندگی میں نہیں تو یہ طے ہے کہ میں خوش قسمت نہیں ہوں۔“ اس کے لب ذرا سے پھیلے تھے۔ ”وہ مجھوں کی متلاشی لڑکی میری ماں اور بہنوں کی باتوں کا شکار ہو جاتی۔ اتنا حوصلہ یا طاقت نہیں تھی مجھ میں اسے لے کر کہیں دور چلا جاتا۔ چلا بھی جاتا تو بھی ایسے وہ احترام اور عزت نہ دلوایا جو اس کا حق بنتی تھی۔ وہ میری زندگی میں شامل نہیں رہے۔ اب بھی حرا نے فزا کے ساتھ مل کر کیا کیا؟ دشمن کم طرف نہیں ہونا چاہیے اماں۔ میری بہنیں اور ماں اس کے معاملے میں بہت کم طرف ہیں۔ دشمنی کو ایک نہ ایک دن دوستی میں بدل لیا جاسکتا ہے۔ کم طرف کو بد لے گا کوئی دن نہیں ہوتا اماں۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی رہتا ہے۔ ذرا سے موقع کے تلاش میں۔ میں مصفا کو کرب سے نکالنا چاہتا تھا۔ اسے مزید اس درد میں دھکیلنا نہیں۔ میں جانتا ہوں اسے بھی یہی لگتا ہے کہ میں نے.....“ آؤر کا تھا۔ اس نے اپنے سر کو چھکا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں نہیں جانتا کون ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں اسے آپ نے پالا آپ نے اس کی پرورش

کی۔ تو پھر یہ طے رہا اماں۔ آپ کے بولنے سے کہیں زیادہ ڈاکٹر سٹیل خوش قسمت ٹھہرا۔ جسے مصفا جیسی لڑکی ملے گی۔“

وہ کہہ کر مسکرایا تھا۔ نہیں بلکہ سکا تھا، کر لایا تھا۔

دروازے کا سہارا لیے کھڑی مصفا وہیں فرس پہ بیٹھتی چلی گئی تھی۔ اور اماں، اماں تو بس اسے جانا دیکھ رہی تھیں۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس کے دل میں جانے کیا خیال آیا۔ وہ پلٹا۔ اور اپنے لیو کو اماں کے ماتھے پر رکھ دیا۔

”اماں! میں رشتوں سے بہت پیار کرتا ہوں۔ ان کے سامنے بہت کمزور پڑ جاتا ہوں۔ مجھے خیر بھی مصفا سے زبردستی شادی کرنے کے لیے میں ان سب کو راضی کر بھی لیتا۔ لیکن ان دونوں کے بیچ چھین کر رہ جاتا۔ نہ اسے تکلف میں دیکھ سکتا۔ اور نہ ہی اپنے گھر والوں کو چھوڑ سکتا تھا۔ بس پھر میں نے خود ہی اپنے دل کو مار ڈالا تھا۔ مجھے معاف کر دینا اماں۔ مجھے پتا ہے اس کے دور جانے کے خیال سے آپ کتنی آزرہ رہیں۔ لیکن میں ہوں آپ کے پاس۔ اور ہمیشہ رہوں گا۔“ کہتے ہوئے اس نے اماں کے ہاتھوں کی پشت پہ بوسہ دیا تو اماں پھل سی گئی تھیں۔ اپنی پوڑی ہاتھوں کو وہ آؤر کے گلے میں ڈال کر پوڑی تھیں۔ باہر اماں اور آؤر رو رہے تھے۔ اور اندر مصفا کو بھی کاش۔

کاش وہ اپنی ذات سے اس حوالے کو ہمیشہ کے لیے دور کر سکتی۔ کاش اس کے بس میں ہوتا تو وہ عظمیٰ کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوتی۔ کتنے کاش اس کے گرد سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اور وہ سر نہ بوڑے بے بس روتی جا رہی تھی۔ اسے آؤر سے والہانہ قسم کا عشق تو نہیں تھا۔ لیکن محبت کی لو اس کے دل میں روشن تھی۔ اور اس لو کو اس کے ماضی کی پراگندہ ہوا میں بجھانے کا سبب بننے کی کوشش کر تو رہی تھیں۔ لیکن اسے بجھانے میں پانی تھیں۔

☆☆☆

پھر اسی لوہم روشتی کے جلتے دیے کے ساتھ اس نے احمد ہاؤس کو چھوڑ دیا تھا۔ اور ڈاکٹر سٹیل کے ہمراہ رخصت ہو کر اسلام آباد سے بہت دور فیصل آباد کے قریبی گاؤں میں آ گئی تھی۔ جہاں ایک نیا جہان اس کا منتظر تھا۔ نئے لوگ، نئی زندگی، نئے رشتے سب کچھ نیا تھا۔ ہاں بالکل نیا۔

تھکاوٹ سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اور سر، سر تو درد سے جیسے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی نہ تو اپنے بچے وجود کی طرف دیکھا تھا۔ نہ ہی اپنے بچے کمرے کی طرف۔ اس نے تو یہاں تک فحشیل کی طرف بھی ایک نظر نہیں دیکھا تھا۔ اس کی شادی کسی سے ہو رہی ہے۔ اس نے یہ جاننے کی یا اس شخص کو دیکھنے کی ذرہ بھر بھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بری طرح اپنے سر کو دہائی اپنے خیالوں میں اتنی مستغرق تھی۔ کہ پاس آ کر بیٹھتے ہوئے سٹیل کی موجودگی کو محسوس نہیں کر پاتی تھی۔

”ہلو۔“ سٹیل نے اس کی نظروں کے عین سامنے چٹکی کو بچایا تو مصفا بری طرح اماں کے خیالوں سے باہر نکلی۔ اور اپنے قریب بیٹھے سٹیل کو دیکھ کر اچھل سی پڑی تھی۔ اور اب اسے حیرت سے آنکھیں کھول کر دیکھ رہی تھی۔ اسے یاد آیا تھا کہ وہ سٹیل سے آؤر کی شادی پہل چکی ہے۔ اور اسے اپنا وہ جھنجھٹایا ہوا رویہ بھی تیار تر جزیات کے ساتھ یاد آ چکا تھا۔

”آہ۔“ سٹیل نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھے ہوئے مصفا کی طرف دیکھا۔ مصفا ناہمی سے اس کے اس انداز کو دیکھا۔

”کتنی خواہش تھی میری دلہن جھونک نکال کر بیٹھی ہوگی۔ میرے دیکھنے پہ شرمائے گی۔ لجائے گی۔ مگر میری دلہن تو۔“ سٹیل نے کہتے ہوئے مصفا کی آنکھوں

ہیں دیکھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بات کو مزید آگے بڑھاتا۔ مصفا رونا شروع ہوئی تھی۔ نٹ کھٹ شرارتی سا ڈاکٹر نیل مصفا کو روتے دیکھ کر اپنی ساری شرارت بھول کر گھبرا کر رہ گیا تھا۔

”اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔ اچھا سوری۔“ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر چپے پیز فائبر کیا تھا۔ لیکن رونے میں کمی کے بجائے زیادتی ہوئی چار سی سی۔

”کچھ تو تیار کیا ہوا ہے؟ میری شکل اچھی نہیں لگی یا پھر یا پھر۔۔۔“ سکیل نے کچھ سوچنا چاہا۔

”مجھے اماں سے بات کرنی ہے۔ مجھے اماں یاد آ رہی ہیں۔“ اپنی سرخ ناک کو ٹٹو سے صاف کرتے ہوئے مصفا بولی۔

”ہیں اس وقت۔“ سہیل نے دیوار گیر
کلاک کی سمت دیکھا۔ جہاں گھڑی کی سوئیاں تین
بج رہی تھیں۔

اس کی حیرت کو اٹکار سمجھتے ہوئے مصفا پھر سے رونے لگی۔

”اچھا اچھا رُکو مس بات کروادیتا ہوں۔ اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔“ سبیل نے جلدی سے سائیڈ میل پر پُرا فون اٹھا کر اماں کا فون نمبر ملایا۔ اور فون مصفا کی طرف بڑھا دیا۔ میل جا رہی تھی۔ آذر اماں کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے سبیل کا لنگ کو اٹکھے ہوئے انداز میں دیکھا اور فون اماں کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کون سا وقت ہے، فون کرنے کا۔ مصفا تم کب پڑی ہوگی۔“ اماں نے مصفا کی آواز سنتے ہی اسے گھر کا۔

”مجھے آپ کی بہت زیادہ یاد آ رہی ہے
اماں۔“ مصفا متنبائی لگی۔

”ہاں توکل ویسے یہ آؤں گی۔ تو مکاؤے کے لیے تمہیں لے کر آؤں گی نا۔“ اماں نے جیسے اسے تسلی دی تھی۔

”اماں کل مجھے لینے آئیں گی۔ میں نے ہر
 نہیں آنا یہاں۔“ کہتے ہوئے مصفا نے چور
 نظروں سے اپنے قریب بیٹھے لینے سنیل کی طرف
 دیکھا جو لینے سے اب اٹھ بیٹھا تھا۔ چند ایک بات
 کے بعد مصفا نے فون کو بند کیا۔ تو ساتھ ہی سنیل
 نے اس کا ہاتھ تمام کر ڈر سا جھٹکا دے کر اسے خود
 کے قریب کر لیا۔

”اور میں تمہیں یہاں سے اب کہیں نہیں جانے دوں گا۔“ محبت بھری سرگوشی میں کہتے ہوئے سہیل نے اس کا ہاتھ اپنے دل پر رکھا۔ مصفا کی کان کی لوہیں تک سرخ پڑ گئی تھیں۔ اسے یوں شرماتا دیکھ کر سہیل نے خود سوسا ہو کر اس کے قریب آ کر اسے اپنی جہم مان مانہٹوں میں بھر لیا تھا۔

ایا اور اسے اپنی بہن یا بھائی کی طرح سمجھا۔
 پہلے تو مصفا کسمائی بھی۔ اور پھر سیل کی
 بات چٹھکھٹا کر غصہ پڑی بھی۔ اور پھر سیل سے
 چائے کا کبہ کر اس نے اپنے سر درد کا بتایا۔ تو وہ فوراً
 ہی اس کے لئے جانے اور ٹیبلٹ چلے آتا تھا۔

”وہ جس میں تو پہلے ہی اپنی عملی میں خاصا شہسپور ہو چکا ہوں اب تم زن مرید کا ٹیگ بھی پھینک دینا۔“ جنیل نے ہنستے ہوئے اس کی سرخ لاک کو ہتھتے ہوئے کہا۔

مصفا نے استغفار کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں میٹھیوں کے جہاں کو دیکھتے ہی اپنی نظروں کو جھکا لیا۔ جہاں منیل کا قہر بے ساختہ تھا وہیں اس کے لیوں پہ بکمرنے والی مسکراہٹ بھی بے اختیار

وہ اس طرح بات کر رہے تھے۔ جیسے ازل
ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ جاننے کے
ضدیاں ضروری تو نہیں ہوتیں۔ چند لمحے بھی
ہوتے ہیں۔ اور آذرب کی شادی میں ملنے
وہ چند لمحے جب سبیل اسے بلانے آیا
اس کے لیے ڈھیر دن خوشیاں لے کر آئے
یہی خوشیاں جس کی اماں کو اس کے لیے

☆ ☆ ☆

”پہلی نظر کی محبت۔ یقین نہیں رکھتا تھا
لیکن ہمیں دیکھتے ہی دل میاں تو.....“ سہیل
میں۔ ایسے کے بعد وہ فریش ہونے کے
اسے تیار ہاتھ۔ اور اب مگلاوے
لے اپنے کمرے میں آئی تھی۔ اور اب مگلاوے
پانے کے لیے اپنی چیزوں کو بیگ میں رکھ کر
تھی۔ اسے تیرا سوٹ اپنی میں رکھا دیکھ کر سہیل
نے اس ہاتھ کو تھام لیا تھا۔ اور اسے مضبوط ہاتھ
نے اس نظر میں جھانکنے لگا۔

”تم نے کل واپس آ جانا ہے۔“ اس کے
لہجے میں استحقاق تھا۔

معا کوکل سے اپنی قسمت پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ زندگی اس کے لیے اتنی مہربان کیسے ہو سکتی تھی۔ اماں نے ہزاروں دعاؤں کے ساتھ بہت سے خدشوں کے ساتھ رخصت کیا تھا تو کیا اماں کی ہماری دعائیں اس کے حق میں مستجاب نہیں ہوں گی۔

سین اس کی خزاں بھری زندگی میں ایسی
اربن کر آیا تھا کہ اس کے ہر سو خوب صورت
بولوں کی خوشبو بکھری گئی تھی۔ وہی کیوں اس کے
مرا دلے جو اماں کے دور پرے کے رشتے دار
تھے اور سین کی دادی کی اس کی اماں سے اچھی
سی دوستی تھی اس رشتے کی خوب صورتی کوئی گنا
ماں کی تھی۔

وہ سادہ طبیعت اور حساس بھرے دل رکھنے
 میں آگئی تھی۔ جو عزت دینا جانتے تھے۔ جو
 یں سے محبت کرنا انہیں نبھانا بھی جانتے تھے۔
 میل تو وہ جیسے مصفا کا دیوانہ بن بیٹھا تھا۔ اور
 خوشیوں بھری راہ گزرے گزرتے جہاں نہ
 کے ماضی کے حوالوں کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔ اور
 اسے اس کی ماں کے ماضی کے ساتھ منسوب
 باتا تھا۔ وہ خوش بھی بے انتہاء، بے حد۔
 وہ روز اماں سے بات کرتی۔ انہیں اپنے

پاس آ کر رہنے کا کہتی۔ مگر خود ان جہاد میں مشکل سے ذو بار اسلام آباد ہی تھی۔ ایک تو آذربائیجان کے پاس آ چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی اب کوئی بھی بات ایسی کو کرنے کے لیے ملے۔

اور دوسرے ان اپنوں کے رویے کا اثر تھا، جو وہ جانے بے گھبرائی تھی۔

انہی دنوں سخیل کا ٹرانسفر لیورپول ہوا تھا۔
اسے گریڈ بڑھانے کے ساتھ سکھر کے ہاسپٹل میں
ریفر کیا جا رہا تھا۔ اور مصفا اس کے ساتھ جا کر
رہنے سے صاف انکاری تھی۔

”مجھے اتنی دور نہیں جانا۔ آپ چلے جائیں۔“ وہ ناک چڑھا کر کبھی صوفے کے دوسرے کنارے آ بیٹھی تھی۔

”میرے بغیر وہ لوکی۔“ سنیل نے اسے
تھوڑا سا دبا کر اپنے قریب کرتے ہوئے ناراضی
سے استغفار کیا۔

”بس مجھے اتنی دورا کیلے نہیں رہتا۔ پہلی بار گھر اور گھر والوں کا احساس محسوس ہوا ہے۔ اب بس مجھے.....“

کہتے ہوئے معصافانے اپنے یاسیت بھرے
کونچے کو حتی المقدور عام لہجے میں ڈھالنے کی کوشش
کی۔ اوزر وہ اپنی اس کوشش میں بری طرح
مظہری ہوئی۔ لہجے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی
اس کی بھی۔

”ایک تو تمہیں ہر چھوٹی بات پر بہت سارا جانے کیوں آجاتا ہے۔“ سٹیل نے اس کی کوکھ پر ہونے ماحول میں رچی اداسی کو دور کیا۔

”ایک بات پوچھوں۔“ اول روز سے دل
موجود سوال کو آج ہونٹوں پہ لانے سے روک
باری تھی۔

”ایک کیوں..... دو تین بلکہ چار ہاشا
”ستیل کے لہجہ میں محبت ہی محبت تھی۔
”آپ کو پتا ہے۔ میرا مطلب آپ کے گھر

والوں کو پتا تھا کہ میری..... وہ اپنی خردی انگلیوں کو مروڑتی ہوئی اپنی بات مکمل نہیں کر پار ہی تھی۔ سکیل نے گہرا سانس لیا۔ سامنے چلتے لی وی کو ریموٹ کی مدد سے بند کیا۔ اور مکمل طور پر مصفا کی طرف مڑ گیا۔ جو اپنی بات مکمل کرنے کے بجائے اپنے لیوں کو دانتوں تلے کھینچنے میں مصروف تھی۔

”جب میں نے آؤر بھائی کی شادی سے آنے کے بعد اپنے گھر میں تمہارے لیے بات کی تھی تو میری وادی نے مجھے یہی کہا تھا۔ اگر تم سرس ہو اور بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کر رہے ہو تو اپنی سوچ کو ایک بار پھر سے کھینچ لو۔ لوگ ماضی کی کئی دوسروں کی غلطیوں کا حساب ان کے بچوں سے مانتے ہیں۔ شک کرتے ہیں۔ اگر تمہیں بعد میں مصفا سے سوال کرنا پڑے گا تو اس بات کو سہیں ختم کر دو۔ اور اگر تم اس کی ماں کی غلطیوں کا حساب اس سے نہیں طلب کرو گے پاس بات کو اپنے ذہن کے کسی بھی گوشے میں نہیں لاؤ گے جب میں خدیجہ سے مصفا کو مانگوں گی۔ اور میں نے ان سے کہا تھا۔ مجھے ماضی کی کسی بات سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اس ماضی سے جس سے مصفا کا کوئی بھی تعلق نہیں۔ ہاں حوالہ ہے اس کی ماں۔ اور حوالے ہونے سے دوسرا انسان کسی کا جواب وہ نہیں ہوتا۔ تم..... تم ہو میرے لیے اور مجھے تمہاری ماں کے ماضی سے کوئی لینا دینا نہیں۔“ وہ کہہ کر دیرے سے مسکرایا۔ لیکن یہ کیا.....!

مصفا کی آنکھوں سے بارش کے قطروں کی مانند گرتے آنسو سکیل کو حیران کر گئے تھے۔ ”مصفا“ اس نے مصفا کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھایا۔ ”لوگوں کو مجھ سے نہیں میری ماں کی غلطیوں میں زیادہ انٹرسٹ تھا۔ جب بھی میں نے سراٹھا کر کھڑا ہوتا چاہا۔ میرے کندھوں پہ ماں کے

بھاگ جانے کا بوجھ اتلا دیا جاتا تھا کہ مجھے خود اپنے ہونے پہ غصہ آنے لگتا۔ میں کیوں تھی؟ مجھے تو پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے تھا۔ بلکہ مجھے تو پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ وہ اب روری تھی۔ پوری شدت سے روری تھی کہ سکیل کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

”اس دنیا نے ہمیشہ مجھ سے تاوان سالا ہے۔ ہمیشہ مجھے شکوک بھری نظروں سے دیکھا۔ کیوں سکیل۔ میری ماں نے کیوں میرے ساتھ ایسا کیا تھا۔ کیا انہیں نہیں پتا تھا یہ دنیا مجھ سے ان کے کیے کا حساب مانگے گی۔ میں کیسے جیوں گی۔ کیسے مقابلہ کروں گی؟“

وہ اب آنسوؤں سے بھری نظریں سکیل پہ گاڑے ہوئے اس سے سوال کر رہی تھی۔ اور اس کے پاس اس کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک بھی جواب نہیں۔ سکیل کے آگے بڑھ کر پاس پہنچی مصفا کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ جہاں وہ سر رکھے تھی ہی دیر تک آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

☆☆☆

اور پھر اسے سکیل کے ضد کرنے پہ اس کے ساتھ سکھڑا پڑا تھا۔ شروع کے بہت سارے دن تو گھر کی شگفتگی میں گزرے تھے۔ لیکن گھر کے سیٹ ہونے اور سکیل کا اسے کام والی رکھ دینے کے بعد اس کے پاس تو جیسے کرنے کو کچھ ہی نہیں تھا۔ لیکن وہ خوش تھی۔ یہاں اس کے ماضی کی کوئی بات نہیں تھی۔ دن میں وہ کتنی ہی بار خدا کا شکر ادا کرتی۔ تو بھی گہرا کرہو پڑتی۔ کتنی ماں کے سامنے تو بھی سکیل کے سامنے اور یوں وہ دونوں ہی اس کے ان دیکھے خدشوں بدل نہ جانے کی فریادوں کو سن کر ہنس پڑتے تھے۔ شکر کرنے سے عطا کی گئی نعمتوں میں فروانی ہوتی ہے۔ اور یہ اس کے شکر کا ہی نتیجہ تھا۔ جب اسے اپنے وجود میں کسی دوسرے وجود کی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔

لے بھر کے لیے جانے کیوں اس کے ہاتھ پاؤں تن سے ہوتے تھے۔ وہ خوش ہونا چاہتی تھی۔ مگر ہو نہیں پار ہی تھی۔

”ایسی بات ہے بیگم صاحبہ! کیا آپ خوش نہیں ہوئیں۔“ اس کی ملازمہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اس کے پاس آئی تھی۔ مصفا نے کچھ بھی کہنے کے بجائے غائب دماغی سے اپنے قریب بیٹھی اس ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھا۔ جس کا اصل نام تو جانے کیا تھا۔ لیکن سب اسے ”انجی“ بلاتے تھے۔

”پتا نہیں۔“ اس کے لب ہولے سے پھر پڑائے تھے۔

”کیا میری ماں کو میرے ہونے کی خوشی ہوئی تھی؟“ مصفا کے اندر سے کسی نے سوال کیا تھا۔

”اولاد کی نعمت ہر ایک کا نصیب نہیں بنتی۔“ انجی کے لہجے میں یاسیت تھی۔ اتنی افسردگی کہ اپنے خیالوں میں گھومتی ہوئی مصفا چونک سی گئی تھی۔

”تو کیا تمہارے پاس اولاد نہیں؟“ مصفا اپنی سوچوں کو جھٹک کر اب اس سے سوال کر رہی تھی۔ ایک سادہ سا انجی کے چہرے پہ لہرایا تھا۔ وہ کچھ بھی کہنے پر اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنا ادھورا کام مکمل کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

سکیل، ماں اور اس کے سرال والے سب ہی بے حد خوش تھے۔ سوائے مصفا کے عجیب سوچوں میں گہری مصفا خوش ہونا چاہتی تھی لیکن خوشی کو محسوس نہیں کر پار ہی تھی۔ اس کے دل میں ایک ہی سوال کنڈلی مار کر بیٹھ چکا تھا۔

”اگر میں بھی اپنی ماں کی طرح اچھی ماں ثابت نہیں ہو سکتی تو.....“

”تم پاگل ہو مصفا! تم کیوں اپنا مقابلہ اپنی ماں سے کر رہی ہو۔“

سکیل نے اسے ڈپٹا تھا۔ لیکن وہ تو جیسے اپنی

سوچوں کے سامنے بے بس تھی۔ جگ آکر سکیل نے ماں کو سکھ بلایا تھا۔ ماں کو سامنے دیکھ کر مصفا کی ساری کلفت، ساری اداسی جیسے کھسک دور جاسوئی تھی۔

”انجی! میری ماں کے لیے جلدی پانی لے کر آؤ۔“ مصفا نے ماں کا ہاتھ تھامتے ہوئے انہیں صوفے پہ بٹھاتے ہوئے کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگاتی تھی۔

سکیل ماں کا سامان اٹھائے ساتھ میں آؤر کو لیے لاؤنچ میں وارد ہوا تھا۔

”ارے آپ۔“ وہ آؤر کو دیکھ کر خوب حیران ہوئی تھی۔ سکیل نے اس کے لیے اتنے سر پرانے اکٹھے کیے تھے۔ اس کی آنکھیں بے اختیار نم ہوئی تھیں۔ اس کی شادی کے بعد پہلا موقع تھا۔ جب اس کے بیکے سے کوئی اس کے گھر آیا تھا۔

”اب ظاہری ہی بات ہے ماں، اکیلی اتنی دور کا سفر تو نہیں کر سکتی تھیں۔ لیے میں نے آؤر بھائی کی منت کی تھی۔ کہ میری بیگم کا دماغ خراب ہو چکا ہے اور ہاسپٹل سے مجھے گھنٹی لٹنے کے جانسز زیر پرست ہیں۔ سو آپ ہی مجھ پر رحم کریں۔ ماں کو سکھ لے آئیں۔ تاکہ وہ میری کھٹکی اور ٹھوڑی پاگل سی بیگم کا دماغ ٹھیک کر سکیں۔“ مصفا کے قریب آتے ہوئے سکیل نے خستے ہوئے کہا۔ تو مصفا بے اختیار ہی تھپ تھپ سی تھی۔ اور پھر مسکرا دی۔

”کیسی ہو؟“ آؤر نے آگے بڑھ کر اس سے استفسار کیا۔ اس سے پہلے کہ مصفا کوئی جواب دیتی کچن سے نکلتی انجی کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ کر زمین پر ہو چکی تھی۔ وہ خوں یکدم ہی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو جہاں انجی عرف انجی، ماں کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ وہیں ماں حیرت سے کھلی کود رہی تھیں۔

”باجی! آپ کوئی بھی کام ٹھیک سے نہیں

کرتیں۔ میرے جنم کے برتن..... اس سے پہلے کہ مصفا اپنی بات مکمل کرتی۔ باقی بھاگتی ہوئی اماں کے قریب آئی تھی۔

”میری بیٹی۔“ اس کے لب پھڑپھڑائے تھے۔ اس سے بات نہیں ہو پاری تھی۔ وہ بس اماں کے قدموں میں بیٹھی رو رہی تھی۔ ”میری بیٹی سے مجھے ایک بار ملو ادیں اماں۔ میری بچی سے مجھے ملو ادیں۔“

ساکت کھڑی اماں نے اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو ہلایا تھا۔ اور مصفا کی طرف دیکھا۔ جو حیرت سے منہ کھولے بھی اماں کو دیکھ رہی تھی۔ تو بھی اماں کے دونوں پاؤں پکڑ کر روئی باقی کو۔ اور تو اور سنبھل اور آؤ خود حیرت سے کنگ کھڑے تھے۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ چھوڑیں میری اماں کو۔“ مصفا کو بے تحاشہ آہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر زمین پر بیٹھی عظمیٰ کو پرے ہٹانا چاہا تھا۔ لیکن اس نے اور بھی مضبوطی سے اماں کے پیروں کو پکڑ لیا تھا۔

”اماں! زندگی بھر بچھتا ہوں۔ زندگی بھر اولاد کے لیے تر پی ہوں۔ یہ خالی گود میں نے خود اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ ہمیشہ خالی ہی رہی۔ اس گھر کو چھوڑنے، یا اور کو چھوڑنے سب سے بڑی بات اپنی بیٹی کو چھوڑنے کے بعد میں بہت تر پی ہوں۔ لیکن میرے پاس واپس آنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ دو سال کے بعد ہی فراز کے گردے ملے ہو گئے تھے۔ اور پھر وہ ساری زندگی.....“

”یہ کیا بولے جا رہی ہے اماں؟“ مصفا نے اماں کو دیکھا۔

”تمہاری بیٹی تو تمہارے سامنے کھڑی ہے عظمیٰ۔“ اماں کے لفظ تھے یا پھر صور اسفل جہاں اب عظمیٰ کے آنسو ٹھہرائے تھے۔ وہی مصفا حیرت زدہ کی ساکت ہوئی تھی۔ ”یہ ہے تمہاری بیٹی عظمیٰ جسے تم فقط دو ماہ کی چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔“

اماں نے مصفا کا بازو تھام کر کہا۔ تو زمین پر بیٹھی عظمیٰ اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔

”اور تمہیں بہت شوق تھا نا۔ اس عورت کو دیکھنے کا جو تمہاری ماں تھی۔ یہی تو ہے تمہاری ماں، مصفا۔“ اماں نے روئی ہوئی مصفا کو ہلاتے ہوئے کہا۔

”میرا دل کہتا تھا۔ میرا دل اس کی طرف ہلکتا تھا۔ اماں آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ کیا سب میری مصفا ہے۔ میری بیٹی لیکن میں نے اور یاد دلائی تو اس کا نام زینب رکھا تھا۔ آپ نے بعد میں نام بھی بدل دیا۔“ عظمیٰ کہتے ہوئے بے قراری سے مصفا کی طرف بڑھی گئی تھی۔ جو نکلا اس کے ہاتھ مصفا کے چہرے کے قریب آئے تھے۔ مصفا نے نفرت سے عظمیٰ کے ہاتھوں کو جھٹک دیا تھا۔

”مجھے ہاتھ بھی مت لگانا۔ میری ماں بس میری اماں ہیں۔ میرے گھر سے نکل جاؤ۔“ مصفا نفرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے چلائی گئی۔

”ایسے نہ کہو بیٹی میں.....“

”اپنی ناپاک زبان سے مجھے بیٹی مت کہو۔ ماں کا منصب تم جیسی عورتوں کے لیے نہیں ہوتا۔ جو اپنی خواہشوں کی اتنی غلام ہوتی ہیں کہ اپنی کوکھ سے پیدا کی گئی اولاد کو جھینک کر چلی جاتی ہیں۔ میں نہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کیونکہ میں نے وہ سب سہا ہے جو میرا حق نہیں تھا۔ بھائی ہوئی عورت کی بیٹی کہلوانا کتنا مشکل ہے۔ یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔“

وہ اب اونچا اونچا رو رہی تھی۔ سنبھلنے آگے بڑھ کر روئی ہوئی مصفا کو اپنے ساتھ لگایا اور عظمیٰ تکم کو ہاں سے جانے کا کہا۔

”چلی جائیں۔ آپ چلی جائیں۔“ مصفا چلاتی ہوئی بولی اور پھر اگلے ہی لمحے ہوش و خرد سے بے گانہ ہو کر سنبھل کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کچھ ماہ کے بعد اس کے قدم تنگ و تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے لکڑی کے ٹوٹے دروازے کے سامنے آکر رکے تھے۔ اس نے دلت کر اپنے عقب میں آتے شخص کی طرف دیکھا۔ جس نے رکتے ہوئے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا تھا۔ فکر بھری نگاہیں نم ہوئی تھیں۔ اور اب وہ دلت کر اپنے ساتھ کھڑی عورت کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”نہی ہے۔“ اس نے رنگ اڑے اور بوسیدہ دروازے کی سمت اشارہ کیا۔ تو وہ اثبات میں مسکرا کر ہولے سے دستک دے کر اندر داخل ہو چکی تھی۔

چھوٹے سے صحن کے اس پار فقط ایک ہی کچا کرا تھا۔ جس سے باہر آئی عظمیٰ اپنے گھر میں مصفا کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ سورج کی بچی تھی۔ پیش صحن کو اس وقت بھی اچھا خاصا گرما رہی تھی۔ مصفا نے اپنے سر پر اوڑھی چادر سے اپنے چہرے پر آئے پسینے کو صاف کیا تھا۔

”آؤ، آؤ نا۔“ عظمیٰ کیسکیائی ہوئی آواز میں اسے کمرے میں چلنے کا کہنے لگی تو مصفا نے چپ چاپ قدم بڑھا دیے۔

عظمیٰ جلدی سے اس کے لیے موڑا حالے آئی تھی۔

”آپ کے شوہر کی وفات کا سنا۔“ مصفا نے بیٹھے ہوئے عظمیٰ کی طرف دیکھا جو اس کے سامنے بڑی چارپائی پر بیٹھ چکی تھی۔ اور اب خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بس آنسو تھے جو اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔

”میں واپس جا رہی ہوں۔ سنبھل کا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔“ مصفا نے اپنے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے

اضطراری انداز میں کہا۔ سامنے بیٹھی عظمیٰ کی پورسی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں میں روانی در آئی تھی۔ کتنے ہی پل خاموشی کے ان دونوں کے بیچ سکون کی مانند گرنے لگے تھے۔

”دعا کیجیے گا۔ میں اپنی بیٹی کے لیے اپنی ماں جیسی ماں ثابت نہ ہوں۔“ مصفا نے کھڑے ہوتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ جانے کیوں اس کا لہجہ بھیک رہا تھا۔

”ہاں نہیں میں یہاں کیوں آئی ہوں؟ میں آنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن.....“ مصفا نے کہتے ہوئے اپنی انگلیوں کو مروڑا تھا۔ اور پھر اس نے اپنے دائیں کندھے پر ٹپکے برس کو کھولا۔ اور اس میں سے ایک چپک نکال کر عظمیٰ کی طرف بڑھا دیا۔

”میں چاہتی ہوں۔ آپ اپنی زندگی کو اچھے سے جنس۔ ان بیویوں سے آپ اپنے لیے چھوٹا سا گھر خرید سکتی ہیں۔ اور باقی پیسوں کو بینک میں رکھ کر ہر ماہ منافع سے اپنی زندگی کو گزار سکتی ہیں۔ اس لیے میں یہاں آئی ہوں۔ تاکہ آپ کو.....“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے مصفا۔ بس ایک بار مجھے تمہیں گلے لگانا ہے اس سے زیادہ کی حسرت اور ضرورت نہیں ہے مجھے۔“ عظمیٰ نے منت بھرے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

”لیکن مجھے اس سے زیادہ کی ضرورت تھی۔ ماں کی آغوش کی، ماں کی محبت کی۔ کاش ایک بار بس آپ میرے بارے میں سوچ سکیں۔ لیکن تب آپ کو میری ضرورت نہیں تھی۔ آپ تو اپنا گھر، اپنا شہر، اپنی ماں سب کچھ چھوڑ کر یہاں اتنی دور آئی تھیں۔ اور یہ قسمت بھی نا۔“ وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

”کتنی عجیب شے ہے۔ مجھے یہاں لے آئی۔ اور دیکھیں کیسے آپ کو میرے گھر کام کے بہانے بھیج دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا تب بھی آپ